

جنوری
2013ء

تعلیم و تربیت

موسیٰ و آلہٴ موسیٰ علیہ السلام مبارک

سورۃ طہ



الغیر

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس شمارے میں

1	مدیر	اداریہ
2	محمد طیب الیاس	درس قرآن و حدیث
3	کرامت بخاری	نعت رسول مقبول ﷺ
4	اشتیاق احمد	اگر
6	ضیاء الحسن ضیا	نئے سال کا پیغام
7	احمد عدنان طارق	گولا ہوا بندر
11	عبدالرشید فاروقی	گڑیا
15	علیم چغتائی	شامی سواری
18	عروج فاطمہ	آئیے عہد کریں
19	محمد فاروق دانش	بے مقصد کام
24	ادارہ	سوال یہ ہے کہ.....!
25	علی اکمل تصور	الجھن
28	پرویز قارئین	میری زندگی کے مقاصد
29	ڈاکٹر طارق ریاض	بچوں کا انسائیکلو پیڈیا
31	نورالعین	کھیل دس منٹ کا
32	ادارہ	بلات عنوان
33	محمد فہیم عالم	سچا عاشق رسول ﷺ
37	جاوید بسام	کام کرنا ضروری ہے
40	علی شیخ	چچا تیز کام پولیس۔۔۔
44	راشد علی نواب شامی	پیارے اللہ کے۔۔۔
46	نہجہ کھوجی	کھوج لگائیے
47	ہونہار ادیب	آپ بھی لکھیں
51	غلام حسین مبین	سہرے لوگ
53	اوپس احمد	ریت اور پتھر
54	ذہین قارئین	داؤدی علمی آزمائش
55	نہجہ قارئین	آپ کا خط ملا
57	ظفر حسنین	انوکھی دنیا
60	نذیر انبالوی	گولی

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے
سرورق: عید میلاد النبی ﷺ

پیارے بچو! آپ کو نیا عیسوی سال 2013ء مبارک ہو۔

نئے سال کے آغاز پر آپ اس بات پر غور کریں کہ گزشتہ سال آپ نے جن کاموں کے کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ مکمل ہوئے ہیں یا نہیں۔ آپ پچھلے سال کے مکمل اور نامکمل کاموں کی فہرست بنالیں، ایسا کرنے سے آپ نئے سال کے لیے بہتر انداز میں منصوبہ بندی کر سکیں گے۔ ہر گزرنے والا لمحہ انسان کو یہ پیغام دے کر جاتا ہے کہ وہ دوبارہ نہیں آئے گا۔ وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں، جو وقت کے بے لگام گھوڑے کو قابو میں رکھتے ہیں۔ نئے سال کے آغاز پر آپ یہ عہد کریں کہ اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے، کیوں کہ جو وقت کو ضائع کرتا ہے وقت اُسے ضائع کر دیتا ہے۔ اللہ کرے یہ سال ہم سب کے لیے اپنے دامن میں امن، خوش حالی اور شادمانی کا پیغام لے کر آئے۔ رواں ماہ کی پندرہ تاریخ سے بھری سال کے تیسرے مہینے ربیع الاول کا آغاز ہو گا۔ اس مبارک مہینے کی 12 تاریخ کو محسن انسانیت، محبوب خدا ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ آپ ﷺ کی آمد سے دنیا پر چھائے جہالت کے اندھیرے چھٹ گئے اور ہر طرف نور ہی نور پھیل گیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیارے نبی ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، اُس کا آغاز ”اقراء“ یعنی پڑھا! کے لفظ سے ہوا تھا۔ گویا پہلی وحی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اسلام میں علم حاصل کرنے کی کس قدر اہمیت ہے، علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا پہلا فریضہ ہے۔ آپ ﷺ نے علم حاصل کرنے کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ علم کا حصول یقیناً ہماری تمام پریشانیوں کا حل ہے۔ پیارے نبی ﷺ سے محبت کا تقاضا ہے کہ ہم آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلیں اور تعلیمات نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہوں۔ ہماری طرف سے عید میلاد النبی ﷺ کی پیشگی مبارک باد قبول کریں۔

”کہانی نمبر“ کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ ہم نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ شمارے سے انعامی مقابلوں کے تمام ”کوپن“ ایک صفحہ پر شائع کریں گے، لیکن ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ صفحہ نمبر 24 پر تمام انعامی سلسلوں کے کوپن موجود ہیں، اور ہاں اسی صفحہ پر آپ ایک نیا انعامی سلسلہ ”سوال یہ ہے کہ.....!“ بھی ملاحظہ کیجئے۔ یہ انعامی سلسلہ آپ کو یقیناً بہت پسند آئے گا۔ ”تعلیم و تربیت“ پاکستان میں بچوں کا واحد رسالہ ہے جس میں سب سے زیادہ انعامی سلسلے ہیں۔ ہم کچھ اور نئے سلسلے بھی لا رہے ہیں، بس تھوڑا سا انتظار کیجئے۔

اب آپ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجئے۔

خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

سرکولیشن اسٹنٹ

مشیر

اسٹنٹ ایڈیٹر

ایڈیٹر، پبلشر

چیف ایڈیٹر

محمد بشیر راہی

سعید لخت

عابدہ اصغر

ظہیر سلام

عبد السلام

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔

042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816

E-mail: tot.tarbiatfs@gmail.com

tot tarbiatfs@live.com

پرنٹر: ظہیر سلام

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ”تعلیم و تربیت“ 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 6278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔

ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

مشرق وسطی (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

قیمت فی پرچہ:
25 روپے

درس قرآن و حدیث

اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

محمد طیب الیاس

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بلاشبہ قیامت کے دن مومن کے ترازو میں جو سب سے زیادہ بھاری چیز رکھی جائے گی وہ اس کے اچھے اخلاق ہوں گے۔“

عام طور پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نیکی صرف نماز، روزے کا ہی نام ہے، کسی سے اچھے طریقے سے پیش آنا، خندہ پیشانی سے ملنا، اس کو تکلیف دینے سے باز رہنا وغیرہ کو نیکی نہیں سمجھا جاتا حالانکہ یہ اعمال بھی نیکی میں شمار ہوتے ہیں اور جب اعمال کو تولا جائے گا تو اُس وقت اُن کو بھی ترازو میں تولا جائے گا۔

پیارے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مجھے تم میں سب سے زیادہ وہ لوگ محبوب ہیں جن کے اخلاق سب سے زیادہ اچھے ہیں اور یہ بھی فرمایا کہ ایمان والوں میں کامل ترین وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔“ (مشکوٰۃ شریف)

معاشرے میں وہی شخص عزت پاتا ہے جو اچھے اخلاق کا مالک ہے اور جس کا کردار اعلیٰ و عمدہ ہے اور نبی پاک ﷺ کے ہاں بھی وہی محبوب ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں اور ایمان بھی کامل اسی کا ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں۔

پیارے بچو! کیوں نہ ہم بھی اپنے اخلاق اچھے کر لیں تاکہ ہمارا ایمان بھی کامل ہو جائے اور ہم اپنے آقا اور محبوب پاک ﷺ کے پیارے بن جائیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے پیارے صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر رخصت کیا، ان کا پاؤں سواری پر تھا آپ ﷺ کی آخری وصیت یہ تھی کہ لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنا۔

ہم اس درس کو اس نصیحت پر ختم کر رہے ہیں کہ آپ بھی اپنے ملنے جلنے والوں سے اچھے اخلاق سے پیش آئیں۔

☆.....☆.....☆

اللہ رب العزت نے اپنے پیارے نبی ﷺ کے اخلاق کے بارے میں فرمایا:

”اور بے شک آپ ﷺ بڑے اخلاق والے ہیں۔“ (سورۃ القلم: ۴)

پیارے بچو! ہمارے پیارے نبی ﷺ اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ آپ ﷺ اپنے چھوٹے چھوٹے کام خود ہی کر لیتے تھے۔ آپ ﷺ مویشیوں کو خود چارہ ڈالتے۔ گھر میں جھاڑو دے لیتے۔ بکری کا دودھ خود دھو لیتے۔ خادموں کو ان کے کاموں میں مدد دیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھا لیتے۔ جب کبھی ضرورت ہوتی بازار سے سودا خود خرید لاتے۔ ہر چھوٹے بڑے کو پہلے خود سلام کرتے۔ اگر کوئی ساتھ ہوتا تو اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے۔ غلام و آقا، کالے اور گورے میں کوئی امتیاز نہ برتتے۔ کیسا ہی چھوٹا اور حقیر شخص دعوت دیتا فوراً قبول فرما لیتے۔ جس قسم کا بھی کھانا سامنے رکھ دیا جاتا نہایت رغبت اور خوش دلی سے کھا لیتے۔

آپ ﷺ کے اقوال و افعال، آداب و اخلاق، عادات و اطوار، اوصاف و کمالات اور سیرت و کردار کو اللہ تعالیٰ نے امت کے لیے نمونہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

”اور تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں بہت عمدہ نمونہ موجود ہے۔“ (الاحزاب: 21)

پیارے بچو! ہم تب ہی کامیاب ہو سکتے ہیں جب ہم آپ ﷺ کی سیرت اور آپ ﷺ کے اخلاق کو اپنائیں۔ آپ ﷺ بہترین اخلاق کے مالک تھے اور آپ ﷺ نے اپنی امت کو بھی اعلیٰ اخلاق حاصل کرنے کی تعلیم دی۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔“

نعمت رسول اللہ ﷺ

بتاتی ہے ہم کو کتابِ جلی
ہمارا نبی ہے نبی آخری
انھیں سے ہمیں ہر ہدایت ملی
عقیدت ملی اور شفاعت ملی
ہوئی روشنی روشنی چار سو
عجب نور احمد کی شمع جلی
یہ قرآن اُن کا قصیدہ ہوا
وہ محبوب رب، وہ خدا کے ولی
ہر اک شاہ اُن کی غلامی کرے
ہر اک دل پر اُن کی حکومت چلی
مدینہ ہوئے علم و حکمت کا وہ
اور دروازہ ہے اُن کا بھائی علیؑ

کرامت بخاری

جلی: روشن، واضح

کہتے ہوئے اس نے نوجوان کا نیچے سے اوپر تک جائزہ بھی لیا۔

اس کا لباس بہت سادہ اور سستا سا تھا۔ پاؤں میں چپل بھی عام سی تھی۔ بال گرد آلود تھے۔ یوں لگتا تھا، وہ بہت لمبا سفر کر کے آیا ہے۔ ”ہاں: وہ میرے سکے چچا ہیں۔“ اُس نے غمگین انداز میں کہا۔

”کیا بات کرتے ہو، میں تمہیں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں..... اگر عدیل صاحب تمہارے چچا ہوتے تو تم کبھی تو یہاں نظر آتے۔“

”میرے بابا نے منع کر رکھا تھا کہ چچا کے گھر نہ جانا۔“

”ارے، اس کا مطلب ہے دونوں بھائیوں میں کوئی جھگڑا ہوا تھا، اس لیے آنا جانا بند تھا..... اب بات سمجھ میں آئی، لیکن اگر تمہارے

بابا نے منع کر رکھا تھا تو پھر اب تم کیوں آئے ہو؟“ ملازم نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس لیے کہ..... اس لیے کہ میرے بابا کا انتقال ہو گیا ہے..... میں تو یہاں ان کی وصیت پوری کرنے آیا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے نوجوان رونے لگا۔

”ارے ارے: تم تو رونے لگے..... اندر آ جاؤ، میں عدیل صاحب کو بتاتا ہوں..... نام کیا ہے تمہارا؟“

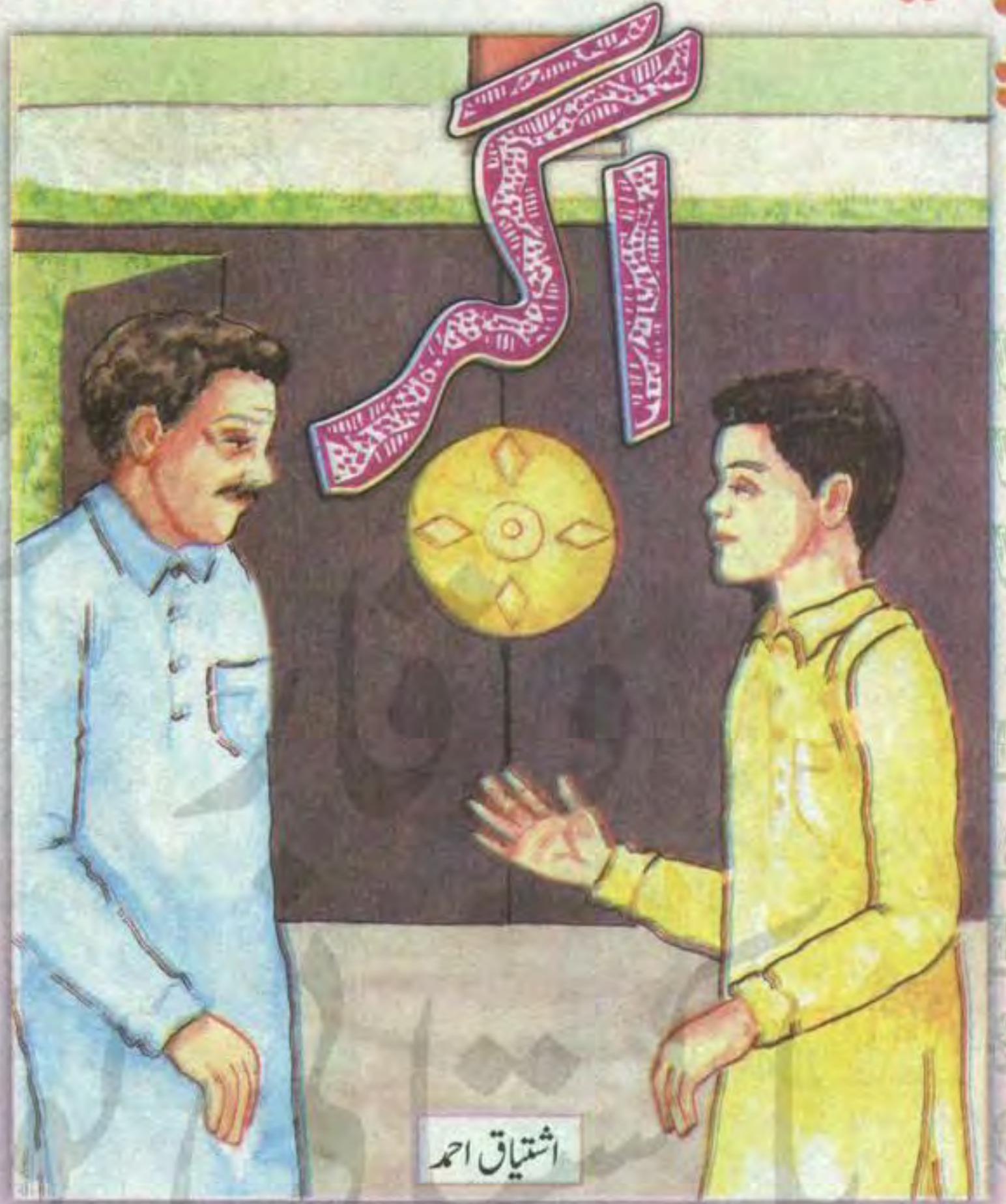
”راشد۔“ اُس نے بتایا۔

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ ملازم کے لہجے میں حیرت تھی۔

”کیا کیسے ہو سکتا ہے؟“ راشد نے بھی حیران ہو کر کہا۔

”عدیل صاحب بہت دولت مند ہیں..... تو ظاہر ہے، تمہارے بابا بھی اتنے ہی دولت مند ہوں گے..... لیکن تمہیں دیکھ کر ایسا نہیں لگتا۔“

”آپ کو بالکل ٹھیک لگتا ہے۔ میرے بابا اتنے دولت مند



ایک عظیم الشان کوٹھی کے دروازے پر رک کر اُس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دُور تک بڑی بڑی اور عالی شان کوٹھیوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ یہ علاقہ گویا کوٹھیوں کا علاقہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھا۔ اس پر ایک پتا لکھا تھا..... جو نمبر کاغذ پر لکھا تھا، وہی کوٹھی کے دروازے پر نظر آ رہا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ درست پتے پر پہنچا تھا۔ اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

دُور کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ اسے تقریباً تین منٹ تک انتظار کرنا پڑا۔ یہ تین منٹ اسے تین گھنٹے محسوس ہوئے۔ آخر قدموں کی آواز سنائی دی..... پھر دروازہ کھلا اور ایک ملازم کی صورت نظر آئی۔ اس نے دروازے کے اندر رہتے ہوئے پوچھا:

”ہاں میاں! کس سے ملنا ہے؟“ لہجے میں کافی حد تک سختی تھی۔

”عدیل صاحب سے، وہ میرے چچا ہیں۔“

”تمہارے چچا!“ اس کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا..... اور یہ

نہیں تھے، میرے دادا ایک غریب کسان تھے، لیکن کسی نہ کسی طرح انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ میرے بابا نے گاؤں میں رہ کر گاؤں کے بچوں کو تعلیم دینا پسند کیا، جب کہ چچا نے شہر میں سرکاری ملازمت کر لی اور چند ہی سالوں میں، دیکھتے ہی دیکھتے بہت دولت مند ہو گئے، میرے بابا نے ان سے کئی بار پوچھا..... عدیل یہ تم اس قدر جلد اتنے مال دار کیسے ہو گئے، تمہاری تنخواہ آخر ہے کتنی..... چچا جان میرے بابا کو اس بات کا جواب نہ دے سکے، کوئی وضاحت نہ کر سکے..... اور اسی بنیاد پر میرے بابا نے ان سے ملنا چھوڑ دیا..... اور.....“

”اور کیا؟“ ملازم نے شدید بے چینی کے عالم میں پوچھا۔
 ”اور کے بعد میں کیا کہنا چاہتا ہوں..... یہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا..... کیوں کہ اس بات کا تعلق چچا جان سے ہے..... آپ جا کر انہیں بتا دیں کہ ان کے بڑے بھائی کا بیٹا راشد آیا ہے۔“
 ”اچھی بات ہے۔ آپ یہاں تشریف رکھیں۔“ وہ ”تم“ سے ”آپ“ پر اتر آیا..... اس کا لہجہ بھی شریفانہ ہو گیا..... پھر وہ چلا گیا..... جلد ہی بھاری قدموں کی آواز سنائی دی..... اور اس کے چچا آتے نظر آئے۔ اس نے اٹھ کر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا، اور سسک پڑے۔

”تو بھائی جان اللہ کو پیارے ہو گئے۔“
 ”جی چچا جان.....“ وہ بھی رونے لگا۔
 عدیل صاحب اسے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ ملازم دونوں کو دروازے پر رک کر دیکھنے لگا۔
 ”شرفو! چائے اور بسکٹ لے آؤ.....“
 ”چچا جان! اس کی ضرورت نہیں۔“

”شرفو! تم جاؤ.....“ انہوں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔
 ”بابا نے کہا تھا..... میرے چھوٹے بھائی کی ایک چیز میرے پاس رہ گئی ہے..... وہ انہیں دے آنا..... تو چچا جان، میں وہی چیز لے کر آیا ہوں۔“

”وہ کیا چیز ہے؟ مجھے تو بالکل کوئی چیز یاد نہیں۔“ انہوں نے کہا۔
 ”آپ نے ایک بار سکول کے زمانے میں ایک تقریری

مقابلے میں حصہ لیا تھا..... اس تقریر پر آپ کو پہلا انعام ملا تھا..... اور شیلڈ بھی ملی تھی..... تقریر کا عنوان تھا، حلال روزی..... اس شیلڈ پر بھی یہی لکھا ہے کہ یہ شیلڈ حلال روزی کے موضوع پر بہترین تقریر کرنے پر دی گئی ہے۔“

یہاں تک کہہ کر راشد خاموش ہو گیا، عدیل صاحب سکتے کی حالت میں بیٹھے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

”اور چچا جان، شاید آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ انہیں یہ شیلڈ پہلے آپ تک پہنچانے کا خیال کیوں نہ آیا..... موت سے پہلے ہی کیوں آیا..... تو چچا جان، ایسی بات نہیں..... انہیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ کی شیلڈ گھر میں کہیں رہ گئی ہے..... یہ تو انتقال سے چند دن پہلے وہ اپنی بہت پرانی چیزوں کو دیکھ رہے تھے..... اور دیکھ دیکھ کر آنسو بہا رہے تھے..... شاید انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی موت کا وقت آ گیا ہے..... ان چیزوں میں انہیں آپ کی شیلڈ بھی نظر آئی تھی۔ اس شیلڈ کو دیکھ کر وہ اور زیادہ رونے لگے تھے۔ پھر مجھ سے کہنے لگے:

”میرا بھائی بہت دُور نکل گیا ہے، شاید اس شیلڈ کو دیکھ کر لوٹ آئے، یہ شیلڈ تم ان تک ضرور پہنچانا۔“

اسی وقت شرفو چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔ چائے کے ساتھ ٹرے میں بسکٹ اور دوسری چیزیں بھی تھیں۔

”چائے لو بیٹا!“ عدیل صاحب نے بڑی مشکل سے کہا۔
 راشد نے ٹرے کی طرف آنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

”شکر یہ چچا جان! اب میں چلوں گا..... مجھے سکول سے بس آج کی چھٹی ملی ہے..... صبح سکول جا کر پڑھنا ہے..... اس لیے اجازت دیں۔“

”یہ..... یہ..... سچ چائے۔“ اس کے چچا ہکلائے۔
 ”اگر..... اگر آپ کے گھر کی چیزیں کھانے میں کوئی حرج نہ

ہوتا تو میرے بابا آپ سے تعلق ہی کیوں ختم کرتے.....“
 یہ کہتے ہی راشد تیزی سے مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

عدیل صاحب پتھر کا بت بنے بیٹھے رہ گئے..... شرفو انہیں حیرت میں گم دیکھتا جا رہا تھا۔

نئے سال کا پیغام

ضیاء الحسن ضیا

آپ سے ہیں شکایتیں مجھ کو
وعدہ کرتے ہیں بھول جاتے ہیں
کھیلنے ہی ملے ہیں جو مجھ کو
بعض پھرتے ہیں دُور گھر سے کہیں
اور کچھ ماں کا دل دُکھاتے ہیں
بھولا اسکول کا کوئی رستہ
اُن سے میں خوش ہوا بہت مل کے
وعدہ کر کے کبھی مُکرتے نہیں
دل سے کرتے ہیں آ کے گھر اُس کو
ہوں گے غافل نہ اب کسی لمحے
دھیان رکھیں گے اپنی عزت کا
پیار کی مشعلیں جلا لیں گے
تم مٹا دو حسد کو نفرت کو
ہر مہینہ ہے آنکھ کا تارا

پھر میں آیا ہوں سالِ نو بچو
آپ وعدہ نہیں نبھاتے ہیں
ایسے بچے بہت سے ہیں، بچو
وقت پر سو کے بعض اٹھتے نہیں
کچھ تو استاد کو ستاتے ہیں
کھولتا ہی نہیں کوئی بستہ
ایسے بچے بھی دیکھے ہیں میں نے
وقت اپنا جو ضائع کرتے نہیں
کام ملتا ہے مدرسے میں جو
اب کریں مجھ سے وعدہ سب بچے
موقع دیں گے نہ اب شکایت کا
بے سہاروں کے کام آئیں گے
میرا پیغام ہے یہی بچو
اک برس کے مہینے ہیں بارہ

سالِ نو سے یہ بولے سب بچے
آپ نے جو کہا وہ مانیں گے

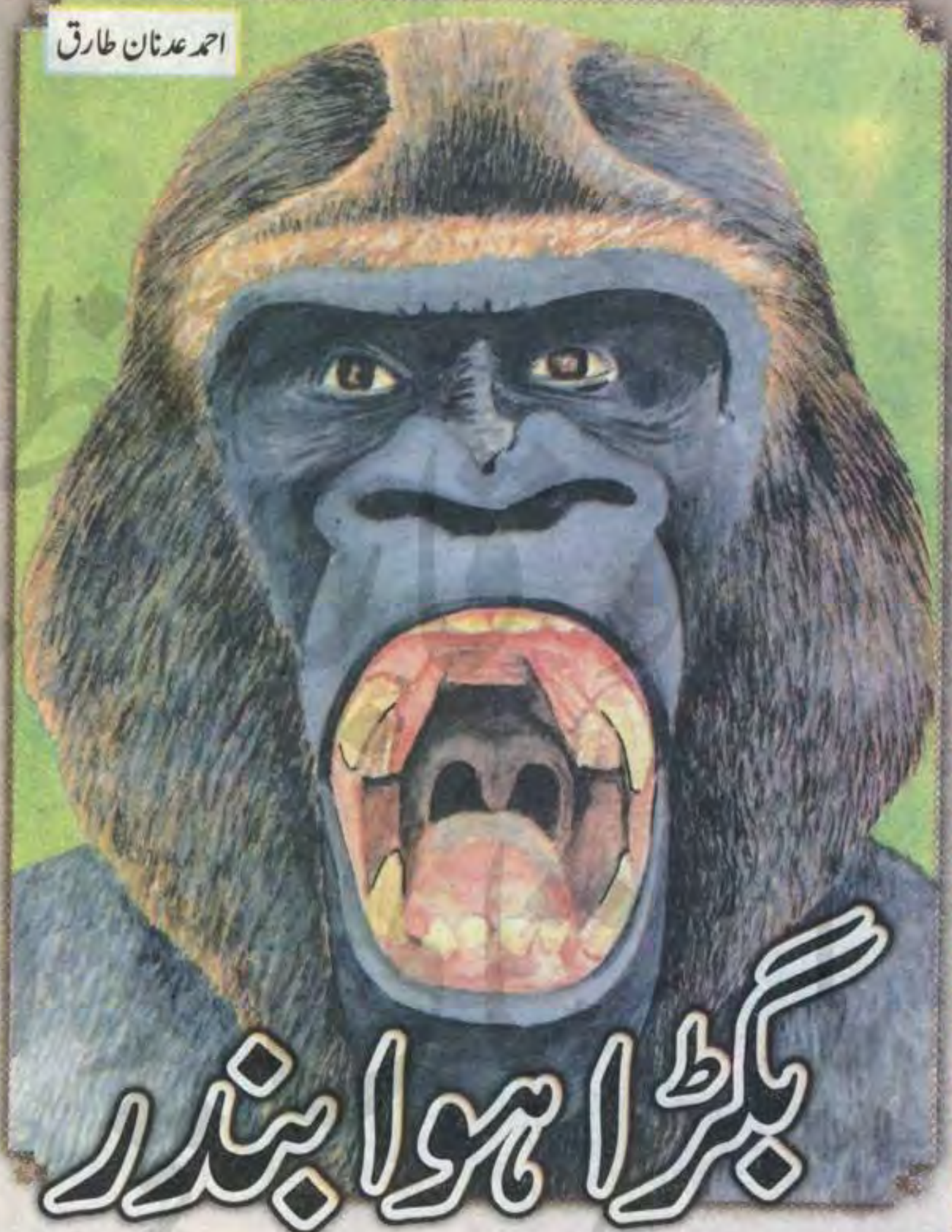
احمد عدنان طارق

بڑا تھا کہ کبھی چھوٹے بندروں کو اُس نے غلام بنا رکھا تھا۔

اُس کا نام شاہو تھا۔ جب بھی بچے اپنے والدین کے ہمراہ بندروں کے پنجرے کے پاس آتے تو امرود، کیلے اور کھیرے اُن کی طرف پھینکتے تو شاہو سب سے پہلے اُن پر قبضہ جما لیتا۔ بے شک اُس کا پیٹ اتنا بھرا ہوتا کہ مزید کچھ کھانے کی گنجائش نہ ہوتی، مگر پھر بھی وہ دوسرے بندروں کا حصہ چھین لیتا۔ اگر کوئی انسان پنجرے کے نزدیک نہ آتا تو شاہو ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور کڑھتا رہتا اور اگر کوئی بندر غلطی سے اُس کے پاس چلا جاتا تو وہ غزانے لگتا اور اُس پر پل پڑتا۔ وہ جان بچانے کے لیے دوڑتا تو شاہو اُسے قابو کر لیتا اور سزا کے طور پر اُس کے بال نوچتا یا پھر اپنے چھریوں جیسے ناخنوں سے اُسے زخمی کر دیتا۔

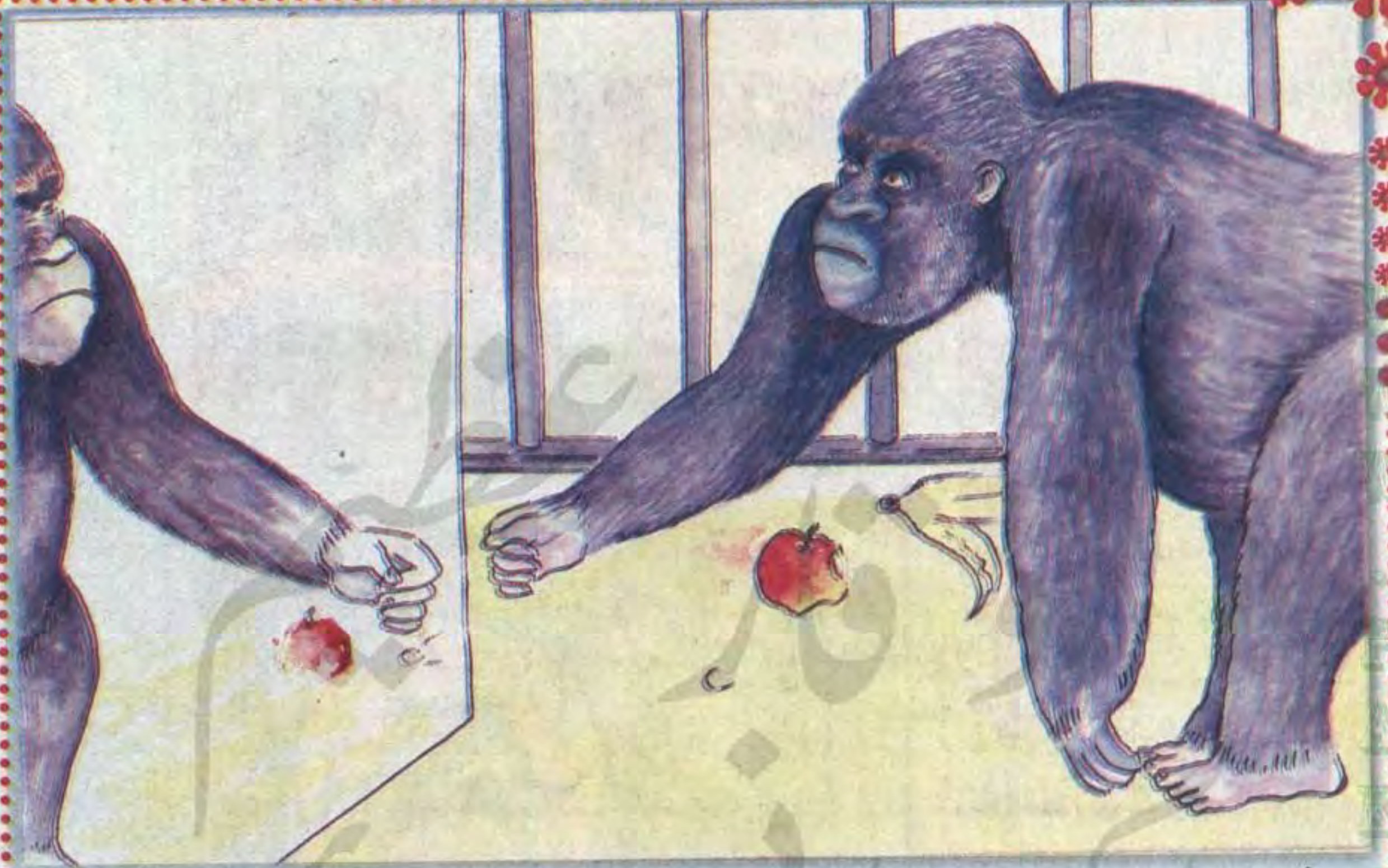
ایک دوسرے کی دُموں کو کھینچتا سب بندروں کا پسندیدہ کھیل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ چالاک شاہو اس کھیل کا چیمپئن تھا۔ جب بھی دو تین بندر پنجرے میں لٹکے خوش گپیوں میں مصروف ہوتے تو ان کی دُمیں نیچے لٹکی اٹھیلیاں کر رہی ہوتیں۔ تو شاہو چپکے سے نیچے آ کر اُن کی دُموں کو اتنی زور سے کھینچتا کہ وہ بے چارے چیختے چلاتے ایک دوسرے کے اوپر آ گرتے، لیکن خود شاہو بیٹھتے وقت اپنی دُم اپنے جسم کے گرد لپیٹے رکھتا۔ اور ویسے بھی کسی بندر کو اُس کے ساتھ شرارت کرنے کی جرأت ہی نہ تھی۔

کریم اُس پنجرے کا محافظ تھا۔ وہ کئی دنوں سے سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے شاہو کو سزا دینے کی ایک ترکیب سوچی۔ ایک رات جب سب بندر سو رہے تھے تو اُس نے ایک قد آدم شیشہ لا کر پنجرے میں رکھ دیا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے اس سے کیا ہو گا، مگر جو ہوا وہ ملاحظہ کیجئے۔



گکڑا ہوا بندر

ہمارے پیارے شہر لاہور کے چڑیا گھر میں ایک بڑا سا پنجرہ ہے، جس میں چھ مٹیلے خاکستری رنگ کے بندر رہتے ہیں۔ خیال ہے کہ وہ افریقہ سے درآمد کیے گئے ہیں۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے چہروں کے تاثرات ہی کچھ اس طرح کے ہوتے کہ اُن کو دیکھ کر ہی بچوں کو ہنسی آ جاتی۔ اوپر سے اُن کی لمبی لمبی دُمیں ہیں۔ اُن بندروں میں سے پانچ تو ہمیشہ ایک دوسرے سے شیر و شکر رہتے۔ حتیٰ کہ اُن کو دیکھنے آنے والے جو فروٹ دے کر جاتے اُس میں سے بھی وہ اپنے حصہ کے مطابق مل بانٹ کر کھاتے، مگر مسئلہ تھا چھٹے بندر کا۔ وہ بہت لڑاکا اور جھگڑالو تھا۔ وہ تمام بندروں سے بڑا اور طاقت ور تھا۔ جو ایک علیحدہ مصیبت تھی۔ کیوں کہ بھلے وہ لڑاکا ہوتا بھی، لیکن اتنا بڑا اور طاقت ور نہ ہوتا تو شاید کسی کو کوئی مسئلہ نہ ہوتا، مگر وہ تو لڑاکا اور جھگڑالو ہونے کے علاوہ جسامت میں بھی اتنا



شاہو کے مقابل آ کر چپت ہو چکا تھا۔ پھر وہ ڈرتے ڈرتے شاہو کے پاس گئے اور اُسے جگایا۔ شاہو کا غصہ عروج پر تھا۔ وہ انہیں گھور کر بولا: ”تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھے جگانے کی۔“

”شاہو! ہم تمہیں بتانے آئے ہیں کہ تم سے بھی طاقت ور ایک بندر پنجرے میں آیا ہے۔ اور وہ تمہاری پٹائی کرنا چاہتا ہے۔ اور اُس کا دعویٰ ہے کہ پٹائی کے بعد تم صرف ایک کونے میں بیٹھنے پر مجبور ہو جاؤ گے اور وہ تم سے تمہاری کھانے والی چیزیں بھی چھین لیا کرے گا جیسا تم ہمارے ساتھ کرتے ہو۔“

اس کے بعد تم خود اُس خوف ناک چہرے کا اندازہ لگاؤ جو شاہو نے بنایا ہو گا۔ غصے سے اُس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ زندگی میں کبھی وہ اتنا ناراض نہ ہوا ہو گا۔ وہ فوراً آئینے کے سامنے پہنچا اور بات بالکل درست نکلی۔ واقعی وہاں ایک طاقت ور بندر موجود تھا۔ شاہو نے کون سا خود کو دیکھا ہوا تھا اور نہ اُسے علم تھا کہ وہ خود کو آئینے میں دیکھ رہا ہے۔

اُس نے آئینے والے بندر کو مخاطب کر کے کہا: ”تمہاری ناک کتنی بد صورت ہے۔ اور تمہاری آنکھیں تو ہیں ہی نہیں۔ تمہیں میرے پنجرے میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ مکا مار کر تمہارا ناک توڑ دوں گا۔“

صبح جب سب بندر بیدار ہوئے تو ایک بندر اچھلتا کودتا آئینے کے پاس گیا اور اُس میں جھانکنے لگا تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اُس نے دیکھا کہ آئینے میں ایک اور بندر بیٹھا ہوا ہے۔ جس کو اُس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اگرچہ وہ آئینے میں خود کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اُس نے کون سا پہلے خود کو دیکھا تھا۔ اور نہ ہی اُسے یہ پتہ تھا کہ آئینہ کسے کہتے ہیں۔ وہ بھاگ بھاگ دوسرے بندروں کے پاس پہنچا کیوں کہ شاہو تو ابھی خواب میں کیلوں اور امرودوں کا صفایا کر رہا تھا۔ انہوں نے شاہو کو نہ جگایا اور کبھی آئینے کے پاس پہنچے تاکہ نئے بندر سے ملیں۔ سب سے چھوٹے بندر نے کہا: ”شاہو کتنا ناراض ہو گا کہ پنجرے میں ایک بندر کا مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ کیوں کہ وہ پہلے ہی ہم سے تنگ ہے۔“

بڑا بندر اور طرح سے سوچ رہا تھا: ”ہو سکتا ہے نیا بندر شاہو کی پٹائی کر دے اور خدا کرے وہ شاہو کی دُم اُسی طرح کھینچے جس طرح وہ ان کی دُمیں کھینچتا ہے۔“

چلو شاہو کو جگا کر بتائیں کہ ایک نیا بندر اُس سے لڑائی کرنے کو تیار ہے۔ واہ! کیا لڑائی ہو گی؟ اور خدا کرے اس میں جیت نئے بندر کی ہو۔ بڑا مزہ آئے گا۔“ بڑے بندر نے خیالوں ہی خیالوں میں لڑائی کا مزہ اٹھاتے ہوئے کہا کیوں کہ وہ ایک دفعہ

آئینے والے بندر نے اتنے ہی غصیلے انداز میں شاہو کو دیکھا۔ جیسے شاہو اُسے دیکھ رہا تھا۔ شاہو نے مکا بندر کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو آئینے والے بندر نے بھی اپنا ہاتھ اُسی طرح اٹھایا۔ بس پھر کیا تھا۔ غصے سے پاگل شاہو نے آئینے میں بیٹھے بندر پر مکوں کی بارش شروع کر دی۔ اور پھر پوری قوت سے اپنے سر سے زوردار ٹکرا آئینے کو ماری، مگر آئینے سے ٹکرانے کی وجہ سے اُس کے سر پر اتنی شدید چوٹ آئی کہ اُس کی آنکھوں کے آگے رنگ برنگے تارے سے ناچنے لگے۔

شاہو نے سر جھٹکا، خود کو سنبھالا اور آئینے پر پل پڑا، مگر پھر اُسے محسوس ہوا کہ اگلے بندر کا جسم شائد فولاد کا بنا ہے۔ آئینے پر مکوں کی برسات سے خود اُس کے دونوں ہاتھوں کا کچھ مر نکل گیا تھا۔ اس کا سر تو پہلے ہی درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ شاہو کے لیے ہار ماننا اگرچہ ناممکن تھا، لیکن وہ کربھی کیا کر سکتا تھا۔ آخر شاہو پنجرے کے ایک کونے میں ہار مان کر سر جھکائے بیٹھ گیا۔ شرم کے مارے وہ زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

اتنی دیر میں باقی بندر انتہائی خوشی کے عالم میں آئینے کے گرد جمع ہو چکے تھے کہ جیتنے والے نو وارد بندر کو مبارک باد پیش کریں، لیکن جب انہوں نے آئینے میں جھانکا تو وہاں ایک نہیں پانچ بندر

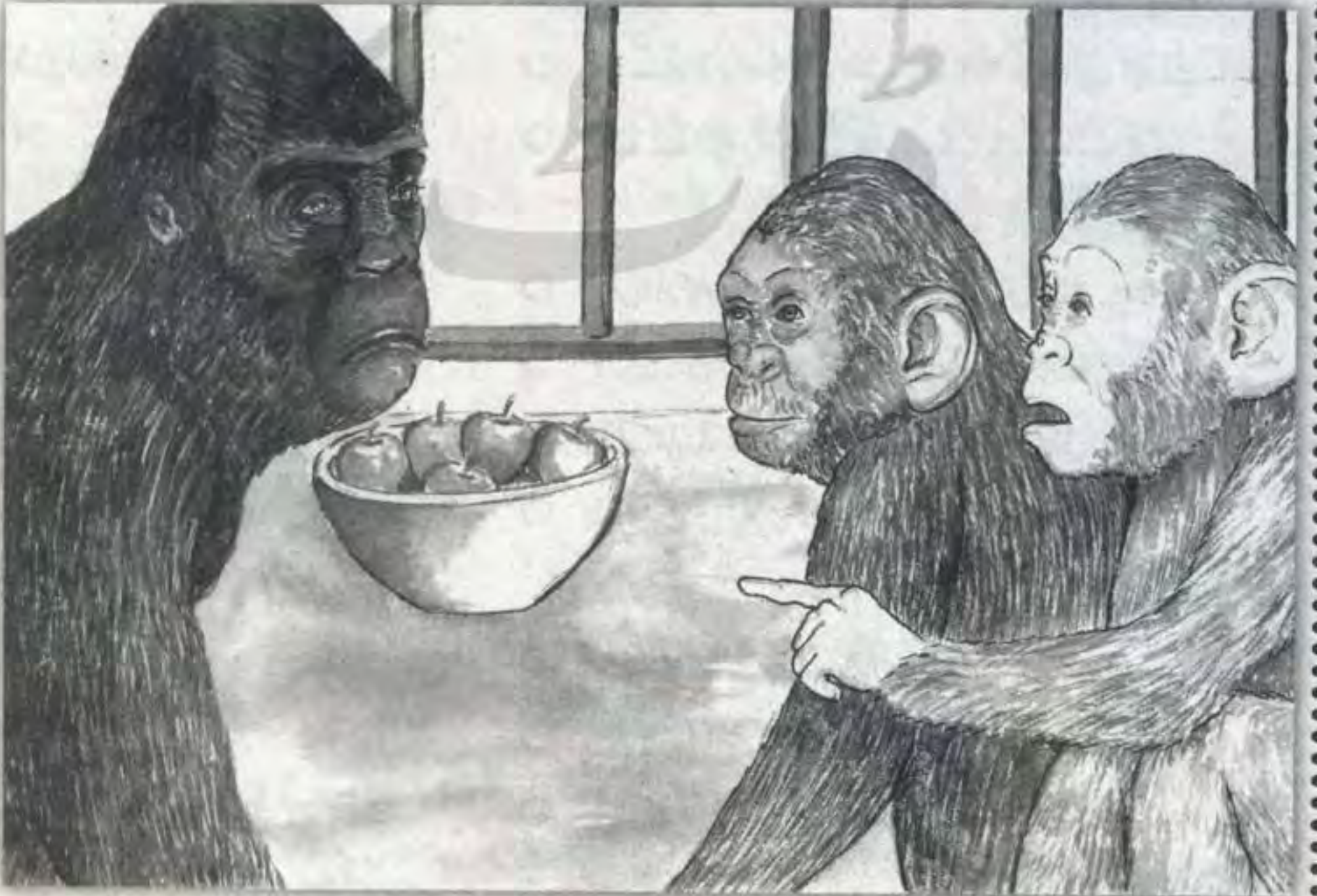
موجود تھے۔ انہیں اس بات کی قطعی سمجھ نہ آئی کہ ایک بندر سے پانچ بندر کیسے ہو گئے۔ پھر انہوں نے سوچا کہ شائد نئے بندر نے پانچ بندروں کا روپ دھار لیا ہے۔ وہ کانا پھوسی میں مصروف تھے کہ ایسا بندر ہی شاہو کو شکست دے سکتا تھا جو جب چاہے خود کو پانچ بندروں میں تبدیل کر لے۔ انہوں نے سوچا کہ یہ تو تمام بندروں کا سردار ہے۔ انہوں نے دل میں تہیہ کیا کہ وہ روزانہ اُس بندر کو سردار مان کر اُسے سلام کرنے جایا کریں گے۔

اب وہ روزانہ آئینے کے آگے جاتے۔ اگر کوئی بندر اکیلا جاتا تو اُسے آئینے میں ایک بندر ملتا۔ اگر اکٹھے جاتے تو آئینے میں پانچ بندر ہوتے۔ وہ بڑی لجاجت سے سردار بندر کو سلام پیش کرتے۔ جہاں تک شاہو کا معاملہ تھا۔ وہ اب تبدیلی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ وہ ایک نیا بندر بن گیا تھا۔ کیوں کہ اب کبھی اُس کا موڈ خراب بھی ہوتا تو دوسرے بندر یہ کہہ کر اُس کا موڈ ٹھیک کر دیتے کہ شاہو ٹھیک ہو جاؤ ورنہ وہ سردار کے پاس جا کر تمہاری شکایت کریں گے تو وہ تمہاری پٹائی کر کے تمہیں خود ہی ٹھیک کر لے گا۔

صرف ایک شخص تھا جسے اس ساری بات کا علم تھا۔ وہ تھا کریم، پنجرے کا محافظ۔ وہ جب بھی پنجرے کے قریب سے گزرتا تو شاہو کو سر جھکائے بیٹھا دیکھ کر اس کی ہنسی چھوٹ جاتی۔ صرف اُسے شاہو کی شرافت کے راز کا علم تھا۔

بچو! اب تم جب بھی چڑیا گھر جاؤ تو بندروں کے پنجرے میں شاہو کو ملنا۔ پنجرہ تمہیں آسانی سے مل جائے گا کیوں کہ اُس میں پانچ بندر ہوں گے اور اس میں ایک بڑا آئینہ بھی ہوگا۔

(مرکزی خیال ماخوذ)



معلومات عامہ



- پاکستان 30 ستمبر 1947ء کو اقوام متحدہ کا رکن بنا تھا۔
- پاکستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ 9 جولائی 1948ء کو جاری ہوا تھا۔
- پاکستان کا پہلا سکھ 3 جنوری 1948ء کو جاری ہوا تھا۔
- پاکستان کی پہلی مردم شماری 28 فروری 1951ء کو ہوئی تھی۔
- پاکستان کا پہلا عجائب گھر 1950ء میں کراچی میں قائم ہوا تھا۔
- 1965ء کی جنگ میں سب سے زیادہ فضائی حملے پاکستان کے شہر سرگودھا پر ہوئے تھے۔
- پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی ہے۔
- جولاءِ ہور میں واقع ہے۔
- پاکستان کا سب سے قدیم شہر ملتان ہے۔
- پاکستان کے شہر سرگودھا کو گنو کی وجہ سے کیلی فورنیا آف پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔
- قائد اعظم کا نام محمد علی ان کے ماموں قاسم موسیٰ نے رکھا تھا۔
- محترمہ فاطمہ جناح واحد پاکستانی خاتون ہیں جنہوں نے صدارتی الیکشن لڑا۔
- محترمہ فاطمہ جناح دانتوں کی ڈاکٹر تھیں۔
- پاکستان کا قومی نعرہ پاکستان زندہ باد ہے۔
- کوبرا سانپ کی عمر 100 سال سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔
- انسانی جسم میں انسولین کی زیادتی کو گلوکاجون روکتا ہے۔
- 18 ویں صدی تک انسانی منہ میں دانت 24 تصور کیے جاتے تھے۔
- خام لوہا، مچھلی اور گندم کی پیداوار میں چین کا دنیا میں پہلا نمبر ہے۔
- چائے کی پیداوار میں بھارت کا دنیا میں پہلا نمبر ہے۔
- اون کی پیداوار میں آسٹریلیا کا دنیا میں پہلا نمبر ہے۔
- جنوبی افریقہ سونے کی پیداوار میں دنیا میں پہلے نمبر پر ہے۔
- معدنی تیل کی پیداوار میں سعودی عرب کا دنیا میں پہلا نمبر ہے۔
- قدرتی گیس کی پیداوار میں روس دنیا میں پہلے نمبر پر ہے۔
- کپاس اور چاول کی پیداوار میں چین دنیا میں پہلے نمبر پر ہے۔
- یورینیم کی پیداوار میں آسٹریلیا کا دنیا میں پہلا نمبر ہے۔
- (انصر صابر، دہاڑی)
- درہ خیبر کو پاکستان کا دروازہ کہا جاتا ہے۔
- پنجاب کے پہلے گورنر کا نام سردار عبدالرب نشتر ہے۔
- دنیا کا لمبا ترین بیراج سکھر بیراج ہے۔
- پاکستانی پرچم سب سے پہلے فرانس میں لہرایا گیا تھا۔
- (علی رضا، جھنگ)
- دنیا کا سب سے بہترین نہری نظام پاکستان میں ہے۔
- پولو کو بادشاہوں کا کھیل کہا جاتا ہے۔
- مغل بادشاہ ہمایوں کا سیڑھیوں سے گر کر انتقال ہوا تھا۔
- پولو کی ابتداء تبت سے ہوئی تھی۔
- تیلیوں کا پسندیدہ مشروب شہد ہے۔
- دنیا میں سب سے نیچا ملک ہالینڈ ہے۔
- رقبہ کے لحاظ سے دنیا کا سب سے چھوٹا ملک ویٹی کن ہے۔
- سب سے زیادہ شتر مرغ بھارت میں پائے جاتے ہیں۔
- (عائشہ نیاز، جہلم)
- نیچوں اور پھلوں کی ساخت کا علم کارپولوجی کہلاتا ہے۔
- کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس ہوا سے ڈیڑھ گنا بھاری ہوتی ہے۔
- برف جمانے کے لیے امونیا گیس استعمال ہوتی ہے۔
- بناپستی گھی کی تیاری میں ہائیڈروجن گیس استعمال ہوتی ہے۔
- (رضیہ منیر، تانڈلیا نوالہ)
- چین کا قومی کھیل پٹنگ بازی ہے۔
- ہالینڈ کا قومی کھیل اسکیننگ ہے۔
- جاپان کا قومی کھیل جوڈو کرائے ہے۔
- (سلمان ریاض، گوجرانوالہ)

عبدالرشید فاروقی



انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
”ابو! دودن پہلے آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا
کہ میرے لیے خوب صورت سی گرٹیا لائیں گے
مگر آپ بھول گئے۔“ مریم نے منہ بنا کر کہا۔
”اوہ! مطلب ہے...“ ابو کچھ کہتے کہتے رک
گئے۔

مریم نے دیکھا۔ ان کے چہرے پر موجود
مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”ایک تو آپ نے وعدہ پورا نہیں کیا اور اوپر
سے مسکرانے لگے ہیں، یہ کیا بات ہوئی؟“
”بات یہ ہوئی، آپ کی امی بھول گئی ہیں۔“
”امی بھول گئیں، لیکن کیا؟“ مریم حیران تھی۔
اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”میں آپ کے لیے گرٹیا لایا تھا۔“
”گرٹیا لائے تھے، پھر مجھے کیوں نہیں دی؟“
”بیٹی! میں آپ کے لیے کل ہی گرٹیا لے آیا
تھا، لیکن آپ کی امی بھول گئی ہیں۔“
”مطلب ہے، آپ نے گرٹیا امی کو لا کر دی اور

وہ مجھے دینا بھول گئیں، یہ بات ہے!!“

”جی، یہی بات ہے۔“

ان کا جملہ مکمل ہوتے ہی مریم وہاں سے امی کے کمرے میں
گئی اور جاتے ہی بولی:

”امی! میری گرٹیا کہاں ہے؟“

امی نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ میں موجود
کتاب تپائی پر رکھتے ہوئے بولیں:

”گرٹیا الماری میں رکھی ہے، وہاں سے لے لو...“

وہ جلدی سے الماری کی طرف بڑی۔ دروازہ کھولا تو وہ حیران
رہ گئی۔ الماری میں گرٹیا نہیں تھی۔ اس نے پلٹ کر امی طرف
دیکھا۔ وہ ایک بار پھر کتاب کے مطالعے میں گم ہو چکی تھیں۔

”امی... امی... یہاں گرٹیا نہیں ہے۔“ انہوں نے کتاب سے

وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

”مریم بیٹی! کیا بات ہے، ایسے کیوں بیٹھی ہو؟“

اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔
ابو نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اُسے گود میں اٹھا لیا۔ اب
وہ بول اُٹھی:

”ابو! مجھے نیچے اتار دیں، میں آپ سے خفا ہوں۔“

ابو نے جلدی سے اُسے نیچے اتار دیا اور حیرت سے بولے:
”ناراض ہونے کی وجہ؟“

مریم بولی: ”ابو! آپ وعدہ تو کرتے ہیں، لیکن اسے پورا نہیں
کرتے۔“

”بیٹی! میں پوری کوشش کرتا ہوں، جو وعدہ کروں، اسے ہر حال
میں پورا کروں، انسان ہوں اور بھول تو انسانوں ہی سے ہوتی ہے
میری بچی۔ مجھے بتاؤ، میں نے اپنا کون سا وعدہ پورا نہیں کیا ہے۔“

نظر ہٹائی اور بولیں:

امی کی بات سن کر مریم نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور

”میں نے تو گڑیا یہیں رکھی تھی، ذرا غور سے دیکھو۔“ وہ

بولی:

حیران تھیں۔

”کسی نے چرا لی ہے؟“

”گھر میں میرے علاوہ تمہارے ابو اور تم رہتی ہو۔ کل میں نے گڑیا الماری میں رکھی اور آج غائب ہے۔ اس دوران کوئی آدمی گھر میں نہیں آیا، صاف ظاہر ہے، کسی نے گڑیا کو چرا لیا ہے۔“ امی کہتی چلی گئیں۔

اسی وقت مریم کے ابو وہاں آ گئے اور آتے ہی بولے:

”کیا چوری ہو گیا ہے؟“

انہیں بتایا گیا کہ گڑیا مریم تک پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہو گئی ہے۔ یہ سن کر وہ پریشان ہو گئے۔

”بیگم! آپ کے خیال میں، گڑیا کون چرا سکتا ہے؟“

”ایک بات تو طے ہے، ہم تینوں میں سے کسی نے گڑیا نہیں چرائی۔“ امی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر مریم نے بُرا سا منہ بنایا اور بولیں:

”واہ امی! میری گڑیا چوری ہو گئی ہے اور آپ مسکرا رہی ہیں۔“

مریم نے ایک بار پھر الماری کا جائزہ لیا۔ الماری کی اچھی طرح تلاشی لے ڈالی مگر گڑیا نہ ملی۔ اس نے پریشان نظروں سے امی کو دیکھا۔ وہ اُٹھ کر اس کے پاس چلی آئیں:

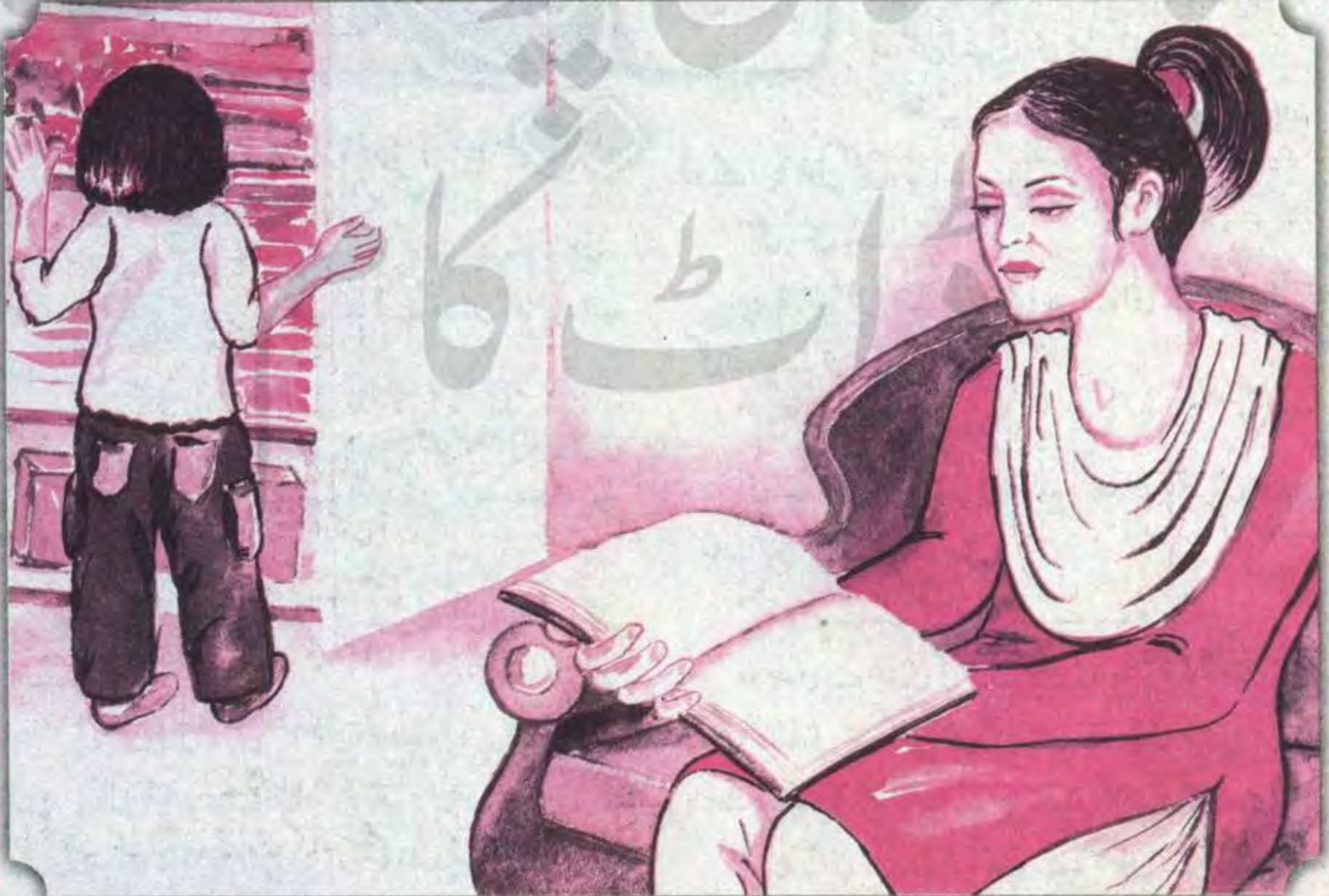
”مریم! مجھے اچھی طرح یاد ہے، تمہارے ابو سے گڑیا لے کر میں نے یہیں رکھی تھی۔“

”امی! گڑیا یہاں ہوتی تو ملتی نا، ضرور آپ نے کہیں اور رکھی ہوگی، آپ بھول بھی تو جاتی ہیں۔ یاد کریں، کہیں اور نہ رکھ دی ہو۔“ مریم نے کہا۔

”بیٹی! ٹھیک ہے، میری یادداشت ذرا کم زور ہے لیکن اتنی بھی نہیں، کل کوئی چیز رکھوں اور آج بھول جاؤں۔“ امی نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

”آخر گڑیا چلی کہاں گئی، اسے زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا!“

”ایسا لگتا ہے، تمہاری گڑیا کسی نے چرا لی ہے!!“



”یہ تو تمہاری زیادتی ہے بیگم صاحبہ۔ گڑیا کی چوری پر تمہیں افسوس کا اظہار کرنا چاہیے۔“ ابو نے کہا۔

”ابو! ہمیں گڑیا کو تلاش کرنا چاہیے۔“ مریم نے ان کی طرف دیکھا۔

ابو نے اس کی تائید کی اور پھر گڑیا کی تلاش شروع ہو گئی۔ گھر میں اچھی طرح گڑیا کو تلاش کیا گیا پھر ملازموں سے پوچھ گچھ کا پروگرام بنایا گیا۔ ملازموں میں ایک باورچی، ڈرائیور اور مالی شامل تھا۔ مالی گذشتہ تین سال سے ان کے ہاں ملازم تھا۔ وہ بڑا ایمان دار تھا۔ وہ اپنی بیٹی عمرانہ کے ساتھ سروٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ ڈرائیور پچھلے پانچ سال سے ان کے ہاں ملازم تھا۔ باورچی بھی پرانا آدمی تھا۔ مریم کے ابو کا کہنا تھا، تینوں ملازم شریف اور نیک ہیں۔ ہمیں ان پر شک نہیں کرنا چاہیے لیکن بیگم اور مریم کے اصرار پر انہوں نے ملازموں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی، تینوں ملازم ایک قطار میں ان کے سامنے موجود تھے اور حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ انہیں یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔ مالی نے آخر پوچھ ہی لیا:

”صاحب جی! کیا بات ہے، ہمیں ایک ساتھ کیوں بلایا گیا ہے؟“

”ایک چوری کے سلسلے میں۔“ مریم کی بات سن کر ملازموں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”کیا چیز چوری ہوئی ہے مریم بی بی؟“ یہ باورچی تھا۔

مریم کے ابو نے تینوں پر ایک نظر ڈالی اور کہنے لگے:

”تم تینوں ہمارے پرانے خدمت گار ہو۔ میں نے آزما کر تمہیں ملازم رکھا تھا۔ اس لیے میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم کبھی اس گھر کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہو لیکن آج محض اس لیے تم لوگوں کو یہاں بلایا ہے کہ ایک چوری کے متعلق تم سے بات کی جائے۔“

”صاحب جی! یہ تو آپ کی اچھائی اور بڑاپن ہے، آپ ہمیں کسی قابل سمجھتے ہیں۔“ ڈرائیور بولا۔

”صاحب! کیا چیز چوری ہوئی ہے؟“ مالی نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ مریم کے ابو نے اس کی طرف

دیکھا اور آہستہ سے بولے:

”کل ہم مریم کے لیے ایک خوب صورت گڑیا لائے

تھے۔ بڑی قیمتی اور پیاری تھی وہ گڑیا، تمہاری مالکن نے اپنی الماری میں رکھی تھی، آج جب گڑیا کو وہاں سے لینا چاہا تو مایوسی ہوئی، گڑیا غائب تھی۔“

”کیا!!!“ تینوں ملازم چلا اٹھے۔

”ہاں! گڑیا اب وہاں نہیں ہے، کسی نے اُسے چرا لیا ہے۔“

وہ بولے۔ ان کی بات سن کر اچانک مالی نے گردن جھکالی۔ اس کا جھکتا سر دیکھ کر سب چونک اٹھے۔ پھر مریم کے ابو کی آواز سب کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ کہہ رہے تھے:

”کیا بات ہے، تم نے سرکیوں جھکا لیا؟“

”صاحب جی! میں آپ کا مجرم ہوں۔“

”کیا مطلب!!“ سب زور سے چلائے۔

”میں آپ کا مجرم ہوں، مریم کی گڑیا میری بچی عمرانہ کے پاس ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ مریم کے ابو حیران تھے۔ مریم کا منہ بھی مارے حیرت کے کھل گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مالی بھی ایسی حرکت کر سکتا ہے۔

”جانتے ہو، تمہارے متعلق ہماری رائے کیا ہے، تم نے یہ بُری حرکت کیوں کی؟ تمہاری بچی کو گڑیا چاہیے تھی تو مجھ سے کہتے، میں اسے بھی گڑیا لا دیتا۔“ ان کی آواز دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے تو دکھ جنم لیتا ہے۔

”صاحب جی! گڑیا میری بچی کے پاس ہے، لیکن میں نے چوری نہیں کی۔“ مالی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”یہ کیا بات ہوئی، تم نے چوری نہیں کی اور گڑیا بھی تمہارے پاس چلی گئی۔“ مریم کی امی کا لہجہ سخت تھا۔

”رجیم گل! تمہاری اس حرکت پر ہمیں بہت دکھ ہوا ہے۔ ہمیں تم سے ایسی اُمید نہیں تھی۔“ مریم کے ابو نے کہا۔

”صاحب جی! میری بات سنیں۔“

”اب کیا تمہاری بات سنیں، تم نے ہمیں بہت دکھی کیا

ہے، ہمارے اعتماد کا خون کیا ہے۔ خود ہی کہو، کیا سلوک کیا جائے تمہارے ساتھ۔“

”پہلے میری پوری بات سن لیں، پھر میرے بارے میں کوئی فیصلہ کیجئے گا۔ کل جب میں کام سے فارغ ہو کر کوارٹر میں گیا تو دیکھا، عمرانہ ایک خوب صورت گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ میں نے گڑیا کے بارے میں پوچھا، اُس نے جواب دیا، اسے یہ گڑیا چھوٹی مالکن کے کمرے سے ملی ہے۔ میں نے اسے گڑیا واپس رکھ کر آنے کے لیے کہاں تو وہ خاموشی سے وہاں سے چل دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خالی ہاتھ واپس لوٹ آئی۔ میں سمجھا، وہ گڑیا رکھ آئی ہے۔ صاحب جی! عمرانہ کو گڑیوں سے کھیلنا بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ اکثر مجھ سے گڑیا لانے کے لیے کہتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پیسے جمع کر کے کوئی اچھی سی گڑیا اُسے لادوں گا۔ کل وہ مریم کی گڑیا اٹھا کر لائی تو میں نے اسے ڈانٹا اور واپس رکھ کر آنے کا کہا لیکن مجھے لگتا ہے اس نے گڑیا واپس نہیں رکھی تھی۔ اگر رکھی ہوتی تو مریم کو ضرور مل جاتی۔ میں اور میری بچی مجرم ہیں، آپ ہمیں سزا دیں، سخت سزا دیں۔“ یہ کہہ کر مالی خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ سب یوں خاموش تھے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ ان کی عجیب حالت تھی۔ آخر مریم کے ابو کہنے لگے:

”رجیم گل! مجھے معاف کر دو، قصور تمہارا ہے اور نہ عمرانہ بیٹی کا۔ قصور تو میرا، میری بیگم اور مریم کا ہے۔ ہم کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ، اپنے گھروں میں کام کرنے والے ملازموں کو کیوں بھول جاتے ہیں، ان کے معصوم بچوں کی معصوم خواہشات ہمیں کیوں دکھائی نہیں دیتیں۔ عمرانہ ابھی بہت چھوٹی ہے، چوری کیا ہے، شاید وہ نہیں جانتی۔ ہم بڑے ہیں، سمجھ دار ہیں۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی معصوم خواہش کو نہ جان سکے اور تم، رجیم گل! تم نے بھی تو بُرا کیا، مجھ سے ایک بار کہہ کر تو دیکھتے۔“ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

”صاحب! وہ... وہ... میں۔“ الفاظ رجیم گل کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

”جو ہوا، سو ہوا۔ اب جاؤ اور عمرانہ بیٹی سے کہو، آج سے وہ گڑیا اُسی کی ہے۔ میں مریم کو دوسری گڑیا لا دوں گا۔“

”اور نہیں تو کیا، وہ گڑیا عمرانہ ہی کی تو ہے۔“ مریم نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اگلے دن مریم اور عمرانہ گڑیوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ دائیں طرف کیاریوں کے پاس کھڑا مالی، انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

☆☆☆





شاہی سواری

”مجھے اچھی طرح معلوم

ہے، تم ہاتھی کے بارے میں
جاننا چاہتی ہو۔“

سلمان صاحب بولے:

”کمال ہے، چچا جان، آپ

تو میرے خیالات پڑھ لیتے

ہیں۔ میں بالکل یہی فرمائش

کرنے والی تھی۔“ ماہ رخ

مزید حیران ہو گئی۔

”دراصل ہم ہزاروں بچوں کو

پڑھا چکے ہیں اس لیے

خیالات پڑھنا بھی آ گیا

ہے!“ سلمان صاحب نے

جواب دیا: ”خیر، آج رات

کو، ان شاء اللہ!“

مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھایا گیا، عشاء کی نماز کے بعد

سلمان صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ماہ رخ نے انہیں یاد

دلایا: ”چچا جان، میں برتن دھو کر بس ابھی آئی۔“

چند منٹ بعد ماہ رخ چچا جان کے کمرے میں موجود تھی۔

سلمان صاحب نے کہنا شروع کیا۔

”بیٹی، ہاتھی بڑا قدیم جانور ہے۔ بڑے جسم اور خوب طاقت

والا جانور۔ اس کی طاقت کو انسان نے مختلف کاموں میں استعمال

کیا ہے۔ کئی جنگوں میں بھی ہاتھی کو شامل کیا گیا، لیکن انسان جب

اس غلط فہمی کا شکار ہوا کہ اس کے پاس بہت سے ہاتھی ہیں اور

اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو عبرت کا نمونہ

بنا دیا۔ تم نے ہاتھی والوں کا قصہ تو پڑھا ہوگا جو اللہ نے قرآن مجید

میں بیان فرمایا ہے۔“

”جی ہاں، چچا جان، سورۃ الفیل، میں نے پڑھی ہے۔ یمن

کے بادشاہ ابرہہ نے خانہ کعبہ پر حملہ کیا تھا اور وہ ہاتھیوں کا لشکر

لے کر آیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں کے لشکر بھیجے، انہوں نے

ابرہہ کے لشکر پر کنکریاں برسائیں اور انہیں کھائے ہوئے بھوسے

”۔۔۔ ل سے لٹو، م سے مرغا، ن سے نارنگی، و سے ورق، ہ

سے۔۔۔“

”ہاتی۔!“ ننھے فرخ نے اچھل کر، ماہ رخ سے پہلے ہی جواب

دے دیا۔ کمرے میں موجود امی جان، ماہ رخ، چچا جان اور چچی

جان، سب ہی ہنس پڑے۔

”ہاتی نہیں ہا۔۔۔ تھی!“ ماہ رخ نے اصلاح کی۔

”ہا۔۔۔ تی“ فرخ نے اپنی توتلی زبان میں درست جواب دیا۔

ماہ رخ، اردو کا قاعدہ سنبھالے فرخ کو حروف تہجی کی پہچان

کروا رہی تھی۔ فرخ کو بعض حروف کے بارے میں یاد نہ تھا کہ ان

سے کون سا لفظ بنتا ہے، لیکن جیسے ہی ماہ رخ ”ہ“ پر پہنچی، فرخ نے

اچھل کر کہا: ”ہاتی!“

”چچا جان۔“ ماہ رخ نے سلمان صاحب کو مخاطب کیا۔

”اس وقت نہیں، رات کو عشاء کے بعد!“ سلمان صاحب

نے اطمینان سے جواب دیا۔

”ارے!“ ماہ رخ حیران رہ گئی۔“ آپ کو کیا معلوم، میں کون

سی بات کرنے والی تھی۔

کی طرح بنا دیا۔“

”شاباش! تم نے بالکل درست جواب دیا۔ اچھا، اب ہاتھی کے متعلق چند دل چسپ باتیں سنو۔ ہاتھی بڑا پرانا جانور ہے۔ پاکستان میں موجود اڑو اور ہڑپہ کے کھنڈرات سے کئی ایسی نشانیاں ملی ہیں، جن سے علم ہوا کہ اُس زمانے میں بھی لوگ ہاتھی کو اپنے کاموں کے لیے استعمال کرتے تھے۔“

”چچا جان، ہاتھیوں کی کتنی قسمیں ہیں؟“ ماہ رخ نے پوچھا۔
”آج کل ہاتھیوں کی دو قسمیں ہیں۔ افریقی ہاتھی اور ایشیائی ہاتھی۔ افریقی ہاتھی زیادہ بڑا اور وزنی ہوتا ہے۔ اس کے جسم کی لمبائی انیس سے چوبیس فٹ تک ہوتی ہے جب کہ ایشیائی ہاتھی کے جسم کی لمبائی سترہ سے اکیس فٹ تک ہوتی ہے۔ افریقی ہاتھی کی اونچائی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ دس سے بارہ فٹ بلند ہوتا ہے جب کہ ایشیا کا ہاتھی ساڑھے سات سے نو فٹ تک اونچا ہوتا ہے۔“

”چچا جان، ہاتھی کا وزن تو ٹنوں میں ہوتا ہوگا۔“ ماہ رخ نے سوال کیا۔

”ہاں! افریقی ہاتھی کا وزن ساڑھے سات ٹن تک ہو سکتا ہے جب کہ ایشیائی ہاتھی کا وزن چار ٹن تک ہوتا ہے۔ ویسے ان دونوں قسموں کے ہاتھیوں میں کچھ اور فرق بھی ہوتے ہیں مثلاً افریقی ہاتھی کے کان بہت بڑے ہوتے ہیں جب کہ ایشیائی ہاتھی کے کان اتنے بڑے نہیں ہوتے۔ افریقی ہاتھی، چاہے نر ہو یا مادہ، اس کے دانت بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ ایشیائی ہاتھی کے تو دانت ہوتے ہیں مگر ایشیائی ہتھنی کے دانت نہیں ہوتے۔“

”چچا جان، ہاتھی کی یہ دونوں قسمیں کہاں کہاں پائی جاتی ہیں؟“

”ایشیائی ہاتھی تو سری لنکا، میانمار یعنی برما، سماٹرا، ملائیشیا، بھارت، نیپال، بنگلہ دیش، چین، انڈونیشیا، کمپوچیا، لاؤس، تھائی لینڈ اور ویت نام میں پائے جاتے ہیں۔ افریقی ہاتھی، جنوبی اور مشرقی افریقہ اور ایتھوپیا اور صومالیہ میں ملتا ہے۔ خیر ہاتھی تو دونوں ہیں، دونوں کی سوئڈ بھی ہوتی ہے، جو بڑی کام کی چیز ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”سوئڈ، ہاتھی کی ناک بھی ہے اور ہاتھ بھی! اللہ تعالیٰ نے اس بھاری بھرکم جانور کو سوئڈ کی شکل میں بہت کارآمد عضو عطا فرمایا ہے۔ سوئڈ سے ہاتھی زمین پر پڑی ہوئی گھاس کی ایک پتی، مونگ پھلی یا سکہ بھی اٹھا سکتا ہے اور لکڑی کے بھاری بھاری لٹھے بھی اٹھا کر چل سکتا ہے۔ سوئڈ سے ہاتھی، کسی بھی چیز کو محسوس کرتا ہے۔ اس سے یہ سانس لیتا ہے۔ جب یہ تیرتا ہے یا پانی میں غوطہ لگاتا ہے تو سوئڈ کو پانی سے باہر رکھ کر سانس لیتا رہتا ہے۔ ہاتھی اپنی سوئڈ میں چار سے پانچ گیلن یعنی اٹھارہ سے بائیس لیٹر پانی بھر لیتا ہے۔ وہ اس پانی کو اپنے جسم پر فوارے کی طرح چھڑک کر نہاتا ہے۔ اگر پانی پینا چاہے تو اس پانی کو اپنے منہ میں انڈیل لیتا ہے۔“

”پھر تو یہ سوئڈ بہت کام آنے والی شے ہوئی۔“ ماہ رخ بولی۔
”سوئڈ سے ہاتھی زرافے کی طرح اونچائی پر موجود ہو بھی سونگھ سکتا ہے اور کسی شکاری کتے کی طرح زمین کو سونگھتا ہوا بھی چل سکتا ہے۔ سوئڈ، درختوں کی شاخیں توڑنے اور نرم زمین میں سوراخ کرنے میں کام آتی ہے۔ سوئڈ سے ہاتھی جانوروں کو ہلاک بھی کر سکتا ہے۔ سوئڈ ہی سے ہاتھی کئی آوازیں نکالتا ہے۔ سوئڈ کی مدد سے ہاتھی، رسی بھی کھول لیتا ہے۔“

”چچا جان، ہاتھی کے دانت بہت قیمتی ہوتے ہیں؟“
”ہاں مگر دکھانے کے دانت! مشہور ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور۔ یہ محاورہ اُس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی فرد ظاہر میں کچھ ہو اور باطن کچھ ہو۔ ہاتھی کے جو دانت نظر آ رہے ہوتے ہیں، یہی ”ہاتھی دانت“ کہلاتے ہیں۔ یہ واقعی قیمتی ہوتے ہیں اور انسان انہی دانتوں کو حاصل کرنے کی غرض سے، بہت سے ہاتھیوں کو مار چکا ہے۔ ہاتھی دانت، ہاتھی کی ساری عمر بڑھتے رہتے ہیں۔ یہ لڑائی میں بھی کام آتے ہیں اور بھاری چیزیں اٹھانے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کی مدد سے ہاتھی، درخت بھی اکھاڑ لیتا ہے۔“

”کیا یہ ہاتھی دانت بہت بھاری ہوتے ہیں؟“
”عام طور پر ایک ہاتھی دانت کا وزن پینتالیس (۴۵) کلو گرام ہوتا ہے، لیکن سن انیس سو (۱۹۰۰ء) میں مغربی افریقہ کے

ایک ہاتھی کے دانت کا وزن ایک سو سترہ کلو گرام تھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ہاتھی جیسی غذا کھاتا ہے، اس کے دانتوں کا رنگ اسی کے مطابق ہو جاتا ہے۔ مثلاً کانگو کے جنگل میں پائے جانے والے ہاتھیوں کے دانت کتھی رنگ کے ہوتے ہیں۔ بانس کے جنگل میں ملنے والے ہاتھیوں کے دانت گلابی ہوتے ہیں۔“

”ایک ہاتھی کے دو ہی دانت ہوتے ہیں؟“

”دکھانے کے دانت عام طور پر دو ہی ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھی چار، پانچ اور سات دانتوں والے ہاتھی بھی دیکھے گئے ہیں۔“

”اور کھانے کے دانت کتنے ہوتے ہیں؟“

”صرف دو عدد۔! لیکن یہ آپ کے دانتوں کی طرح ننھے منے نہیں ہوتے۔ ہاتھی کا ہر دانت کسی اینٹ کی طرح ایک فٹ طویل ہوتا ہے۔ جب ایک دانت گھس جاتا ہے تو اس کے پیچھے سے دوسرا دانت بڑا ہو کر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس طرح ہاتھی کے چھ مرتبہ دانت نکلتے ہیں، پھر ہاتھی کے دانت نہیں نکلتے۔“

”ہاتھی کھاتا کیا ہے؟“

”پودے، گھاس، ٹہنیاں، جنگلی پھل، بانس کی کونپلیں وغیرہ۔ ہاتھی کو کھانا اتنا پسند ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ گھنٹے وہ خوراک تلاش کرنے اور اسے کھانے میں لگا رہتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ہاتھی جتنی خوراک کھاتا ہے، اس میں سے آدھی، ہضم ہوئے بغیر فضلے کی شکل میں اس کے جسم سے باہر نکل جاتی ہے۔ ہاتھی پانی بھی خوب پیتا ہے۔ ایک دن میں تیس گیلن یعنی سوا سو لیٹر سے زیادہ پانی پی جاتا ہے اور خوراک کی تلاش میں وہ ایک رات میں پچاس کلومیٹر دور تک جاسکتا ہے۔“

”چچا جان، ہاتھی تو اتنا بھاری بھرکم ہوتا ہے، یہ اتنا فاصلہ کیسے طے کرتا ہوگا؟“

”بھاری بھرکم ہونے کے باوجود ہاتھی کی رفتار خاصی تیز ہوتی ہے۔ ایشیائی ہاتھی سولہ کلومیٹر اور افریقی ہاتھی چوبیس کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے چل سکتا ہے۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ ہاتھی اپنی پیٹھ پر زیادہ سے زیادہ چھ سو پونڈ اٹھا سکتا ہے، لیکن سونڈ کے ذریعے سے بڑے بڑے بھاری لکڑی کے ٹکے کھینچ کر لے جاتا

ہے۔ ہاتھی چھلانگ نہیں لگا سکتا۔ گہرا گڑھا راستے میں آئے تو رک جاتا ہے۔“

”پھر تو ہاتھی کے راستے میں نہر آ جائے تو وہ آگے جا ہی نہیں سکے گا۔“

”نہیں! ہاتھی بہت اچھا تیراک ہے۔ وہ کئی گھنٹے تک تیرتا ہوا دریا بھی پار کر جاتا ہے۔“

”ہاتھی، انسان کے کس طرح کام آتا ہے؟“

”بہت سے کام ہیں۔ ہاتھیوں سے بوجھ اٹھانے، لکڑی لے جانے، اور ماضی میں جنگوں میں لڑنے کے کام لیے جاتے رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں ہاتھی شاہی سواری کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مغل بادشاہ جہاں گیر کے پاس چودہ ہزار ہاتھی تھے۔ کچھ بادشاہ ہاتھی کو شکار کھیلنے میں استعمال کرتے تھے۔ ہاتھی، پہاڑوں پر بھی چڑھ جاتا ہے۔ دلدل اور گھنے جنگلوں میں بھی چل سکتا ہے، اس لیے ایسی جگہوں پر یہ بہت کام آتا ہے۔“

”چچا جان، ہاتھی اکیلا رہنا پسند کرتا ہے یا اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ؟“

”ہاتھی، خاندان بنا کر رہتے ہیں۔ ایک خاندان میں دس سے لے کر پچاس تک ہاتھی ہوتے ہیں۔ ان کی سربراہ، سب سے بوڑھی ہتھنی ہوتی ہے۔ ہاتھی ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ کوئی ہاتھی بیمار ہو جائے تو دوسرے ہاتھی وہیں رُک جاتے ہیں اور اس کے تندرست ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔“

”چچا جان ہاتھی سوتا کس طرح ہے؟“

”ہاتھی کا بچہ تو دن رات میں پانچ گھنٹے تک سوتا ہے اور سونے کے لیے لیٹ بھی جاتا ہے، لیکن بڑا ہو کر وہ دن رات میں صرف تین گھنٹے تک کھڑے کھڑے سو لیتا ہے۔۔۔ اچھا بھئی ہاتھی تو کھڑے کھڑے سو جاتا ہے، لیکن میں بیٹھے بیٹھے بھی سو سکتا۔ اب ہاتھی کی باتیں ختم۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ اس لیے اللہ حافظ۔“

”چچا جان، آپ نے اتنی اچھی باتیں بتائیں جو میں کئی کتابیں پڑھ کر بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ بہت بہت شکریہ۔ اللہ حافظ۔“

یہ کہہ کر ماہ رخ بتی بجھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

آپے عہد کریں



گلستان کالونی کے بچے شام کے وقت ایک قریبی گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ ایک دن کھیلتے ہوئے شہزاد اور اسد میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ جب اگلے کئی دنوں تک شہزاد کھیلنے کے لیے نہ آیا تو اسد بھی سمجھتا رہا کہ وہ اُس سے ڈر گیا ہے، مگر جب ذیشان نے اُسے بتایا کہ شہزاد بیمار ہے اور نوبل ہسپتال میں داخل ہے تو وہ کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

”اسد! کیا سوچ رہے ہو؟“ ذیشان نے سوال کیا۔

”ہمیں شہزاد کی عیادت کے لیے ہسپتال جانا چاہیے۔“

”مگر تمہاری تو اُس سے لڑائی ہوئی تھی۔“ ذیشان کی بات سن کر اسد نے کہا:

”وہ تو وقتی لڑائی تھی، میرا دل شہزاد کے حوالے سے صاف ہے، وہ اس وقت بیمار ہے اور بیمار کی عیادت کرنے کی بہت فضیلت ہے، پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان جب صبح کے وقت مسلمان بھائی کی بیمار پرسی کرتا ہے تو شام تک 70 ہزار فرشتے اس کے لیے دُعاے خیر کرتے ہیں اور اگر وہ شام کے وقت اس کی عیادت کرتا ہے تو 70 ہزار فرشتے صبح تک اس کے لیے دُعاے خیر کرتے ہیں اور اس کے لیے جنت میں چنے ہوئے پھل ہوں گے۔“

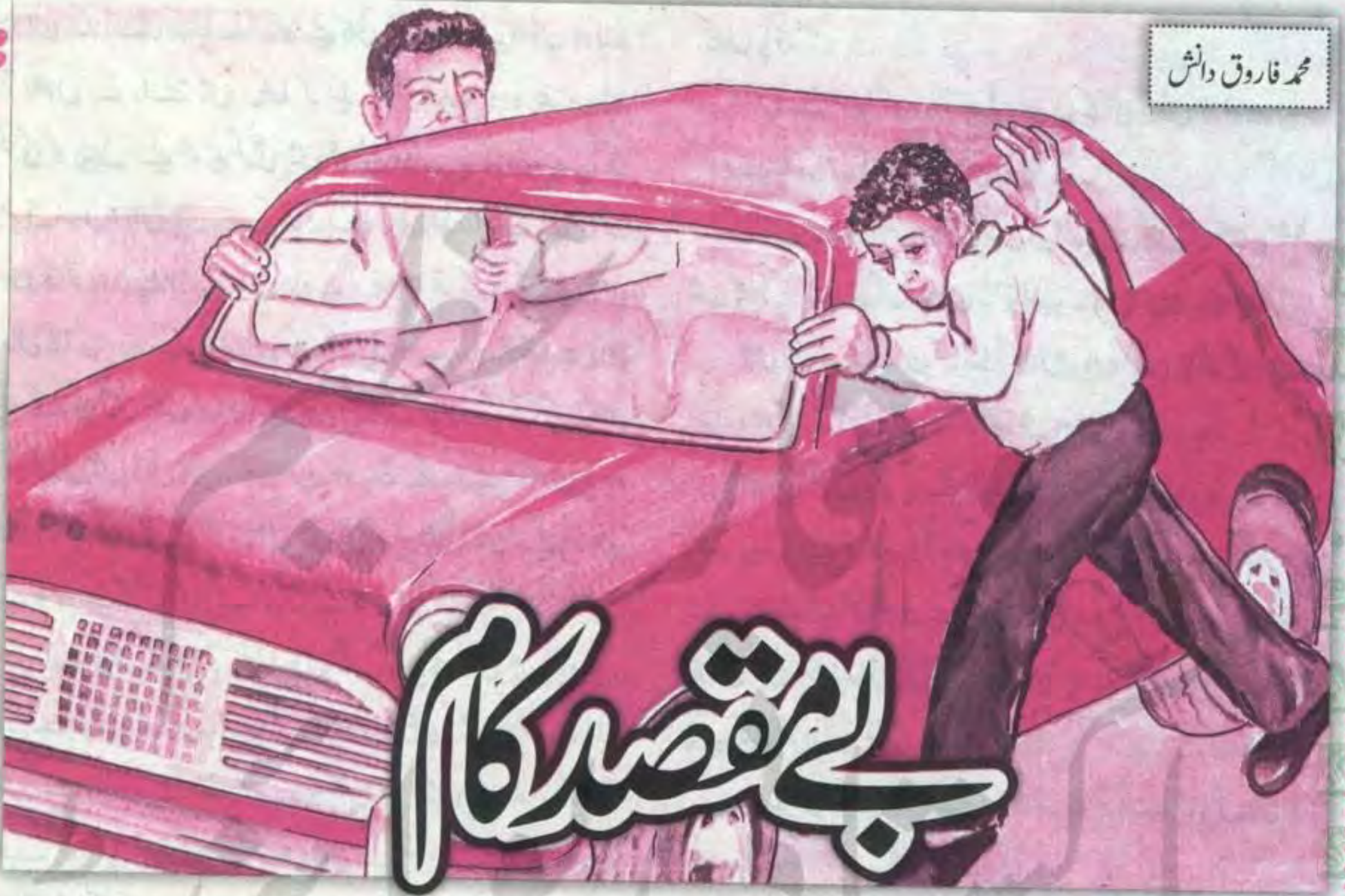
شام کے وقت سب بچے شہزاد کی عیادت کے لیے ہسپتال میں موجود تھے۔ شہزاد سب کو اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اگر آپ کا کوئی رشتہ دار یا دوست بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت ضرور کیجیے۔ جو بچے ایسا کرنے کا عہد کرتے ہیں اُن کے نام اگلے مہینے شائع کیے جائیں گے۔ اس عہد نامے میں شامل ہونے کے لیے کوپن ارسال کرنا ضروری ہے۔



شاباش

ان بچوں نے عہد کیا کہ وہ جب بھی باغ میں جائیں گے پھلوں کے چھلکے باغ میں پھینکنے کی بجائے کوڑے دان میں پھینکا کریں گے۔

سانہ قادری، ملتان۔ جنید نعیم دیوان، حویلی لکھا۔ عبدالمقیت چغتائی، ملتان۔ محمد سالار مہدی، جہلم۔ محمد ریان طیب، راول پنڈی۔ محمد شہزاد حیدر شیخ، محمد نعیم امین، لاہور۔ راجہ فیضان، عبداللہ بن نعیم، جہلم۔ تزئین احمد، فیصل آباد۔ اقراء خان، لاہور۔ تزئین فاطمہ، ملتان۔ آمنہ حیات، کاشف حیات، لاہور۔ محمد ذیشان علی، سرانے عالم گیر۔ عبداللہ بن ثقلین، بہاول پور۔ ارتضیٰ امر، کنڈیاں۔ اسد علی، ملتان۔ آمنہ سعید، دینہ۔ محمد حمزہ، لاہور۔ جرار علی، سالار علی، بلال علی، شیخوپورہ۔ احمد رضا، کراچی۔ عدین سجاد، گوجرانوالہ۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ ندا فاطمہ خان، پشاور۔ محمد حارث بھٹہ، ملتان۔ محمد وقار وکیل، دریا خان۔ حبیب الرحمن، ڈیرہ اسماعیل خان۔ مصباح نور، اوکاڑہ۔ واصف اقبال، میاں والی۔ حسان بدر، بورے والا۔ سعد خالد ظفیر، قلعہ دیدار سنگھ۔ صداقت علی، شہزادی خدیجہ، لاہور۔



بے مقصد کام

پریشانی میں دیکھوں تو اس کی مدد ضرور کروں۔“

صابر نے اُسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا جب کہ

غالب ایسی کسی بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

”ارے بھئی! ایسے بے مقصد کام میں ہم تو پھنس کر رہ گئے

ناں۔“ وہ جل کر بولا۔

”میں نے اپنے والد سے کیا ہوا وعدہ نبھایا ہے، رہی بات

بے مقصد کام کی۔ تو مجھے بھی تمھاری اس بات سے اتفاق ہے لیکن

وہ انکل پریشان تھے پھر ان کے ساتھ ایک طالبہ بھی تھی، وہ کہاں

تک پیدل چلتے۔“ صابر نے اطمینان سے جواب دیا جب کہ غالب

یہ سوچ رہا تھا کہ اُس نے صابر کے ساتھ آکر سنگین غلطی کی ہے۔

صابر کے والد زاہد صاحب نے نئی بستی میں ایک پلاٹ خریدا

تھا اور وہاں پر کچھ سامان رکھوانے کے لیے انھوں نے صابر کو روانہ

کیا تھا۔ صابر اور غالب دونوں اچھے دوست تھے۔ وہ دونوں بڑے

مزے سے باری باری گاڑی چلاتے ہوئے پلاٹ پر پہنچ گئے تھے

اور انھوں نے سامان وہاں پر موجود چوکی دار کے حوالے کر دیا تھا۔

آتے وقت انھوں نے گاڑی میں سو روپے کا پٹرول بھی ڈلوا لیا تھا

”اُف! گرمی دیکھ رہے ہو۔ ایسا حال ہو رہا ہے کہ زمین پر

مچھلی رکھ دو تو وہ بھی سک جائے۔“ غالب نے چندھیائی ہوئی

آنکھوں سے آسمان کی طرف سورج سے آنکھیں ملانے کی ناکام

کوشش کرتے ہوئے صابر سے کہا۔

”کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو بھائی۔“ صابر نے گاڑی کو دھکا

لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی زبان منہ سے باہر نکلے جا رہی تھی۔ پانی

کی پیاس شدت سے لگ رہی تھی۔ لمبی سڑک، دُور دُور تک نہ کوئی

ہوٹل، نہ کوئی سایہ دار درخت اور نہ ہی کوئی پٹرول پمپ۔ اور آپ

کی گاڑی میں پٹرول بھی نہ ہو اور آپ کو گاڑی ایک کلو میٹر پیدل

گھسیٹ کر لے جانا پڑے تو جو لوگ کبھی ایسے حالات سے گزرے

ہیں، وہ ان دونوں کی کیفیت کا اندازہ بہ خوبی لگا سکتے ہیں۔

”یار! آخر تمھیں اس انکل کو اپنی گاڑی سے پٹرول نکال کر دینے

کی ضرورت ہی کیا تھی؟“ غالب جو پچھلے دس منٹوں سے اس کے ساتھ

جلا بھنا چل رہا تھا، اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکا تو چلا کر بولا۔

”کیا کروں یار! مجبوری تھی میرے دوست! میرے ابو نے

مجھ سے ایک وعدہ لیا ہوا ہے کہ اگر میں راستے میں کہیں بھی کسی کو

کیوں پاؤ۔“

اس نے سوچا کہ وہ تو پیدل جائے گا ہی کیوں نہ اسے روانہ کر دے تاکہ اس کی پریشانی ختم ہو جائے۔

”میں پریشان ضرور ہوں لیکن ایسا بے حس نہیں کہ تمہیں مشکل میں چھوڑ کر اکیلا بھاگ جاؤں۔“ غالب نے اپنائیت سے کہا۔

اس کی یہ بات سن کر صابر کا ڈھیروں خون بڑھ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ دوستی میں جذبہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

وہ اسی طرح منہ بناتے بناتے کوئی دو کلو میٹر دور پٹرول پمپ تک پیدل پہنچے تو اُن کی جان میں جان آئی۔ اس کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ضرورت مندوں کی مدد ضرور کی جائے، لیکن گاڑی میں اتنا اضافی پٹرول ضرور رکھا جائے کہ وہ خود بھی پٹرول پمپ تک ضرور پہنچ جائیں۔

جب اس کے والد نے سارا واقعہ سنا تو اُسے شاباش دی اور اسی جذبے کو برقرار رکھنے کی تلقین کی۔

آج اس کے والد کو تن خواہ ملی تو انہوں نے فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں برگر کھلانے کی پیش کش کر ڈالی۔ صابر کو تو ایسی چیزوں سے خاصی دل چسپی تھی۔ وہ، اس کی دونوں بہنیں جویریہ اور سوریہ بھی اس کے والد کے ساتھ چل دیں۔ فوڈ اسٹریٹ پر ماموں برگر والے کی دکان خاصی مشہور تھی۔ اُس وقت وہاں خاصا رش تھا۔ کافی انتظار کے بعد انہیں خوشبوؤں کی لپیٹ کے ساتھ ذائقے دار برگر کے الگ الگ پیکٹ مل گئے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ وہاں بیٹھ کر برگر کھانے کے بہ جائے اپنے گھر جا کر اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ وہ رش سے پیدل نکل کر دور پارک کی گئی اپنی گاڑی کی طرف بڑھے تو اچانک جویریہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پچھے پرانے کپڑوں میں ملبوس دو مفلوک الحال بچے ان کی گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی انہوں نے کھانے کا سوال کر دیا۔ ان کی شکلوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ واقعی بھوکے ہیں۔ زاہد صاحب کو حیرت بھی تھی کہ وہ دونوں کھانے کی دکانوں کے آگے دیگر پیشہ ور فقیروں کی طرح منڈلانے کے بہ جائے ایک کونے میں کیوں کھڑے ہیں؟ وہ ابھی ان سے کوئی سوال کرتے، انہوں

جوان کے آنے اور جانے کے لیے کافی تھا۔ جب یہ واپس ہوئے تو انہوں نے راستے میں دیکھا کہ ایک انکل ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی کو پیدل لیے شدید گرمی میں طویل سڑک پر پٹرول پمپ کی طرف روں دواں ہیں۔ جب صابر اپنے والد زاہد صاحب کے ساتھ ہوتا تھا تو وہ اپنے والد کی اس عادت کو بھانپتا تھا کہ وہ کسی پریشان حال گاڑی سوار کے پاس خود رک کر اپنی جیب سے کاغذات والی پلاسٹک کی تھیلی نکال کر اس میں پٹرول ڈال کر خود ہی ضرورت مند کی گاڑی میں ڈال کر بے حد مسرور ہوتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ اسے تاکید کرتے تھے کہ وہ بھی کبھی کسی کو پریشانی میں دیکھے تو ان کے کام آئے کہ یہ بھی ایک صدقہ ہے۔

اب یہ لڑکے ہی تو تھے ایسی باتیں کب یاد رہتی ہیں، دو چار بار اسے لپ سڑک لوگ پریشانی سے موٹر سائیکل زمین پر لٹائے اس میں سے پٹرول نچوڑتے نظر آئے لیکن وہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے گزر گیا۔ آج گرم موسم میں اُس نے ضرورت مند کو دیکھا تو اس کا دل پسینہ لپک گیا اور اس نے خود ہی گاڑی روک کر انہیں پٹرول کی آفر دے دی۔ وہ کیسے انکار کرتے؟ اس کے پاس اپنے والد کی طرح کوئی پلاسٹک کی تھیلی تو تھی نہیں کہ وہ فوری انہیں تھوڑا سا پٹرول نکال کر دے دیتا۔ لڑکی نے کولڈ ڈرنک پی ہوگی، اس کی بوتل اس کے والد نے صابر کے ہاتھ میں تھما دی تو اس نے مروتا آدھی سے زیادہ بوتل پٹرول کی بھر کر ان کی موٹر سائیکل میں ڈال دی۔ وہ تو انہیں دُعا میں دے کر رخصت ہو گئے لیکن آگے چل کر ان کی گاڑی بند ہو گئی۔ اب اس غلطی کا ازالہ تو کسی طور ممکن نہیں تھا۔ گرمی شدید تھی، سڑک طویل تھی اور ان کی حالت دیدنی تھی۔

زاہد صاحب تو اپنی خدمت خلق کے اصول پر ہمیشہ سے کار بند تھے۔ یہ اصول صابر نے پہلے تو کبھی نہیں آزمایا تھا۔ اسے نیکی میں لطف تو آیا لیکن اپنی پریشانی کے شروع ہوتے ہی اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے اور اب اسے یہی خیال آنے لگا کہ آئندہ وہ کبھی ایسا کرنے کے بارے میں سوچے گا بھی نہیں۔

”غالب! بات سنو۔ سامنے سے ایک موٹر سائیکل سوار آ رہا ہے، تم اس سے لفٹ لے کر شہر پہنچ جاؤ۔ میری غلطی کی سزا تم

نے دیکھا کہ جویریہ نے فوری طور پر اپنے حصے کے برگر کا پیکٹ چھوٹے بچے کے حوالے کر دیا۔ اس نے اسے لے کر ادھر ادھر بھاگنے یا کسی اور سے مانگنے کے بہ جائے عجیب کام کیا۔ وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اس نے لفافہ کھولنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کے بعد اس نے فوراً برگر کھانا شروع کر دیا۔ یہ لمحہ بتا رہا تھا کہ وہ بچہ بھوک سے بے تاب تھا۔ اب اس کے اس عمل کو بڑی بھکارن لڑکی ندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”کیوں میاں صابر! تم نے اپنی ننھی بہن سے کچھ سبق حاصل نہیں کیا؟“

انہوں نے اس کے جذبات اُبھارنے کی کوشش کی۔ اس کا برگر جب تیار ہو رہا تھا تو اس کے منہ میں کتنی بار پانی آیا تھا۔ وہ تو بس اس انتظار میں تھا کہ کسی طور گھر پہنچ کر اسے جلد از جلد اپنے شکم میں انڈیل لے، لیکن یہ کیا؟ اس کے والد تو یہ چاہ رہے تھے کہ وہ اپنا برگر اس میلے کچیلے بچے کے حوالے کر دے۔ پچھتر روپے مالیت کا ایسا برگر اس کے والد کون سا روز روز دلوانے کے لیے تیار ہوتے تھے۔

”ابو! سویرا کا برگر دے دیں۔“ اس نے منہ بسورا۔

”بیٹا! یہ چھوٹی بچی ہے، دل تو تمہیں بڑا کرنا چاہیے۔ جویریہ سے کچھ سبق حاصل کرو۔“

پھر اس کے والد نے اس کو ایسے ایسے جملے کہے کہ اس کو برگر اس بچی کے حوالے کرتے ہی بنی۔ اس کا دل اندر سے کتنا دکھی تھا، وہ اسے کسی طرح بیان کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ آج تو اسے اپنے والد پر سچ مچ غصہ آ رہا تھا۔ جانے وہ کیوں اس طرح کے بے مقصد کام کر کے اپنے ہی بچوں کو اور اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالتے تھے۔

اس کے والد کو اس کے جذبات کا پتا تھا۔ وہ تو اس کے اندر صرف نیکی کا جذبہ اُبھارنا چاہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ گھر پہنچ کر اس کے امی، ابو نے اپنے اپنے حصے کے برگر جویریہ اور صابر کے حوالے کر دیے۔ اسے اپنے رویے پر ندامت تو ہوئی۔ سب نے مل کر برگر کھائے تو اس میں برکت بھی ہو گئی اور ان کا پیٹ بھی

بھر گیا۔ اب اس کے اندر نیکی کرنے کا یہ جذبہ کچھ کچھ اور ابھرنے لگا تھا۔

غالب اور صابر دونوں آج تفریح کے موڈ میں تھے۔ اس کے والد نے خود ہی اجازت دی تھی کہ وہ دو گھنٹے تفریح کر کے آجائیں۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ کچھ دیر بعد وہ اور غالب عوامی پارک پہنچ گئے وہاں انہوں نے خوب تفریح کی۔ جب وہ کھیل کود اور کھا پی کر تھک گئے تو انہوں نے گھر جانے کی ٹھانی۔

گاڑی کبھی صابر اور کبھی غالب چلایا کرتا تھا۔ صابر تو احتیاط سے گاڑی چلاتا تھا، لیکن جب گاڑی غالب کے ہاتھ لگ جاتی تو وہ بے حدرف چلا کر اس پر اپنی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اپنے دوست کی اس ادا کو کبھی کبھار برداشت کر لیتا تھا۔ آج بھی گاڑی غالب کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے پھر وہی داؤ پیچ استعمال کرنا شروع کیے۔ کبھی ادھر کبھی ادھر، کبھی کسی گاڑی کو کٹ ماری اور کبھی دوسری گاڑی کو سائیڈ ماری۔ اسی طرح وہ موج مستی کرتے نظامی پل سے نیچے اتر کر گھر کے قریب پہنچنے والے تھے کہ پیچھے سے ایک اور موٹر سائیکل بڑی تیزی سے ان کے قریب سے گزری۔ اسی اثنا میں پیچھے سے پولیس موبائل کا سائرن سنائی دیا۔ غالب گھبرا سا گیا۔ اس کا لائسنس بھی نہیں تھا اور پھر وہ گاڑی چلا بھی بُرے طریقے سے رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ پولیس کہیں اُسے نہ دھر لے۔ اس لیے اس نے اچانک ہی گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ پولیس نے اب جو دونوں کو مشکوک انداز سے گاڑی بھگاتے دیکھا تو وہ ان ہی کے پیچھے ہو لیے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس نے انہیں پکڑ لیا۔

وہ اس افتاد کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ بہر حال! کچھ ہی دیر بعد وہ تھانے میں تھے۔ ان کو مار پڑنا شروع ہو گئی۔

”میری بات غور سے سنو! اور خوب سوچ سمجھ کر جواب دو۔“ پولیس والے نے کہا۔

”جی....“ وہ ایک ساتھ بولے۔

”کب سے ڈکیتیاں کر رہے ہو؟“

”نہیں... کیسی ڈکیتیاں؟“ غالب نے کہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے

سنہرے موتی

- ☆ اپنے آپ کو گراؤ مت کیوں کہ لوگ گرے ہوئے مکان کی اینٹیں تک اٹھا کر لے جاتے ہیں۔
- ☆ حصولِ علم کی خاطر گھر سے نکلنے والا طالب علم کبھی ناکام واپس نہیں آتا۔
- ☆ ہمیشہ دُوسروں کے لیے اچھا سوچو چاہے دُوسرے تمہارے لیے بُرا ہی کیوں نہ سوچیں۔
- ☆ دُوسروں کو تنگ کرنے والا کبھی خود چین سے نہیں رہ سکتا۔
- ☆ علم دل کو اس طرح زندہ رکھتا ہے جس طرح بارش زمین کو زندہ رکھتی ہے۔
- ☆ دُعا دستک کی طرح ہے اور مسلسل دستک سے دروازہ کھل جاتا ہے۔
- ☆ اگر موت کے بعد اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتے ہو تو موت سے پہلے اپنے رب کی مرضی کی زندگی گزارو۔
- ☆ انسانی رشتوں کی بنیاد تین چیزوں پر ہے۔ احترام، اعتماد اور محبت۔
- ☆ ان میں سے ایک چیز بھی کم ہو جائے تو دُوسری دونوں چیزیں خود بخود ختم ہونے لگتی ہیں۔ (سلمان ریاض، گوجرانوالہ)

تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ کسی کی بلا ان کے سر پر آگئی تھی۔
”زیادہ بھولے مت بنو!“ چھترول کرنے والے نے گھور کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم تو تفریح کر کے آئے ہیں۔“ صابر نے کہا۔
”بکواس نہ کرو، ہم نے تمہیں واردات کے بعد فرار ہوتے ہوئے پکڑا ہے۔“

”ایسا... کچھ... کچھ... نہیں.... وہ تو دُوسرے تھے۔“ غالب نے کہا۔
”میں نے تو اس گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کیا تھا۔“ صابر نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔

انہوں نے بہت کچھ کہا، لیکن ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ایک پولیس افسر باہر سے ہی ان کو دیکھ کر گیا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ حوالات کا دروازہ کھول کر ایک سپاہی نے ان کے آگے کھانا رکھ دیا تھا۔ کھانے میں اس کے پسندیدہ برگر بھی شامل تھے۔
”یہ... یہ... سب کیا ہے؟“

”تم لوگ پیٹ بھر کر کھا لو.... پھر صاحب سے مل لینا۔“
ان کے ذہن میں سوالات تھے، لیکن مار کے بعد بھوک شدید لگ رہی تھی۔ اچانک ہی ان کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک ہونے لگا تھا۔ اب انہیں سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے کھانے کے ساتھ انصاف کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ کچھ ہی دیر بعد انہیں انسپکٹر توحید کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ صابر کو ایسا لگا جیسے اُس نے انہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، مگر کہاں؟ یہ اسے یاد نہ آسکا۔
”ہاں! اب بتاؤ.... تم نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا؟“
”جی....“

”میں جانتا ہوں کہ تم لوگ واردات کرنے والے لڑکے نہیں ہو۔“ انسپکٹر توحید نے کہا۔
”آپ کے اعتماد کا شکریہ!“

”جو لوگ اپنے آپ کو پریشانی میں ڈال کر دُوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں وہ بُرے لوگ نہیں ہو سکتے۔“ انسپکٹر توحید نے کہا۔
اب ان دونوں کو یاد آچکا تھا کہ یہ انسپکٹر حیدر وہی انکل تھے

جنہیں چند روز پہلے پٹرول دے کر سخت گرمی میں وہ پورے دو کلومیٹر پیدل چلے تھے۔
”ایک روز تم لوگوں نے مجھے میری بیٹی کے ٹیسٹ میں لیٹ ہونے سے بچایا تھا۔“ انسپکٹر حیدر کہہ رہا تھا۔ ”اس کے علاوہ بھی میں نے تمہیں دو ایک بار اسی طرح دُوسروں کی مدد کرتے ہوئے دیکھا ہے۔“
وہ اس خدائی مدد پر حیران و پریشان سے ہو گئے۔
”میں تمہیں ذاتی ضمانت پر چھوڑ رہا ہوں۔ پولیس پارٹی، ڈیوٹی والے ملزمان کو پکڑنے جا چکی ہے۔“ وہ کہہ رہے تھے۔ ”ان کے پکڑے جانے کے بعد تم مکمل آزاد ہو گے۔“
کل تک وہ لوگوں کی مدد کرنے کو بے مقصد کام سمجھتے تھے، لیکن آج انہیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہو چکا تھا، انہیں اس بات کا کامل یقین ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کبھی کسی کی معمولی سی معمولی نیکی کو بھی ضائع نہیں کرتا اور اس کا صلہ اسے کسی نہ کسی طور مل کر رہتا ہے۔

وکیل: (خوشی سے) ”یہ بتاؤ تم پر الزام کیا ہے؟“
ملزم: ”مجھے پر اسی ہار کی چوری کا الزام ہے۔“

(علی رضا، جھنگ)

دردناک

استاد (شاگرد سے) ”دردناک کے کیا معنی ہیں۔“
شاگرد: ”جناب! جس کے ناک میں درد ہو۔“

(حافظ محمد فرخ سیاست، پیرگل)

محبت

مالک: ”کیا تمہیں جانوروں سے محبت ہے؟“
نوکر: ”بالکل جناب! خاص طور پر میں بھنے ہوئے مرغ سے بہت
محبت کرتا ہوں۔“

(دقار وکیل انصاری، بھکر)

چینی

ماں: (بیٹے سے) ”جاؤ پڑوسی سے چینی مانگ لاؤ۔“
بیٹا: (تھوڑی دیر بعد) امی! پڑوسی چینی نہیں دے رہے۔“
ماں: ”ہائے کیسا زمانہ آگیا ہے۔ پڑوسی کا خیال نہیں کرتا،
جاؤ بیٹا الماری سے اپنی چینی نکال لاؤ۔“

(جشن ممتاز، ملتان)

کھانا

شوہر: ”آج شام کا کھانا ہم باہر کھائیں گے۔“
بیوی: (خوش ہو کر) ”کیا سچ بچ؟“
شوہر: ”ہاں بھئی! اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟“
بیوی: ”ہم کس ہوٹل میں جائیں گے؟“
شوہر: ”بھئی ہوٹل میں نہیں میرا مطلب ہے۔ آج ہم باہر صحن میں
کھانا کھائیں گے۔“

(ماہ نور عاصم، کراچی)

بستہ

ڈاکٹر: ”تمہارے کندھے کی ہڈی کیسے اتری ہے؟“
پہلوان: ”میں نے غلطی سے اپنے بیٹے کا بستہ اٹھالیا تھا۔“

(حسان بدر، بورے والا)



آئیے مسکرائے

سکہ

ایک سنان سڑک پر ایک راہ گیر نے ایک صاحب کو روکا اور کہا:
”کیا آپ ایک روپے کا سکہ عنایت کریں گے؟“
وہ صاحب بولے: ”ضرور، ضرور مگر آپ کو اس وقت اس کی کیا
ضرورت پڑ گئی ہے؟“
راہ گیر نے جواب دیا:

”بات یہ ہے کہ میں اور میرا ساتھی ایک روپے کا سکہ اچھال کر یہ
فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے کون آپ کا موبائل اور کون
آپ کا بٹوالے گا۔“

(ارتج اعوان، لاہور)

آہستہ چلیں

استاد (شاگرد سے): ”تم سکول دیر سے کیوں آئے ہو؟“
شاگرد: ”میں سکول آ رہا تھا کہ راستے میں بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ
آہستہ چلیں، آگے سکول ہے۔“

(روبینہ ناز، کراچی)

سو نہیں سکتے

استاد: ”تم میری کلاس میں نہیں سو سکتے؟“
شاگرد: ”سو سکتا ہوں جناب! اگر آپ زور سے نہ بولیں تو۔“

(انصر علی، وہاڑی)

ہار

وکیل: ”میں تمہارا مقدمہ لڑوں گا، لیکن کیا تم میرا خرچہ برداشت کر
سکو گے، تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟“
ملزم: ”میرے پاس صرف ایک سونے کا ہار ہے۔“



سوال یہ ہے کہ.....!

- ۱۔ ”اَلْعَلِيْمُ جَلَّ جَلَالُهُ“ کا کیا مطلب ہے؟
- ۲۔ غازی علم دین شہید کے والد گرامی کا نام کیا تھا؟
- ۳۔ پاکستان میں پہلی مردم شماری کب ہوئی تھی؟
- ۴۔ ارفع کریم رندھاوا کی تاریخ پیدائش کیا تھی؟
- ۵۔ ITTF کن الفاظ کا مخفف ہے؟
- ۶۔ کس مغل بادشاہ کا سیڑھیوں سے گر کر انتقال ہوا تھا؟

درج بالا سوالوں کے جوابات جنوری 2013ء کے شمارے میں موجود ہیں۔ آپ رسالہ غور سے پڑھیے اور اپنے جوابات لکھ بھیجئے۔ درست جواب دینے والے تین خوش نصیبوں کو 300 روپے کی انعامی کتب دی جائیں گی۔ تین سے زیادہ درست حل آنے کی صورت میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جائیں گے۔

آئیے عہد کریں

کوچن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 جنوری 2013ء ہے۔

نام _____ مقام _____
میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ _____

ہر حل کے ساتھ کوچن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 جنوری 2013ء ہے۔

کھوج

لگائیے

نام:

شہر:

مکمل پتہ:

ہر حل کے ساتھ کوچن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 جنوری 2013ء ہے۔

نام:

مقام:

دماغ لڑاؤ

پتہ:

کوچن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 جنوری 2013ء ہے۔

سوال یہ ہے کہ.....!

نام _____ عمر _____
مکمل پتہ: _____

میری زندگی کے مقاصد

کوچن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

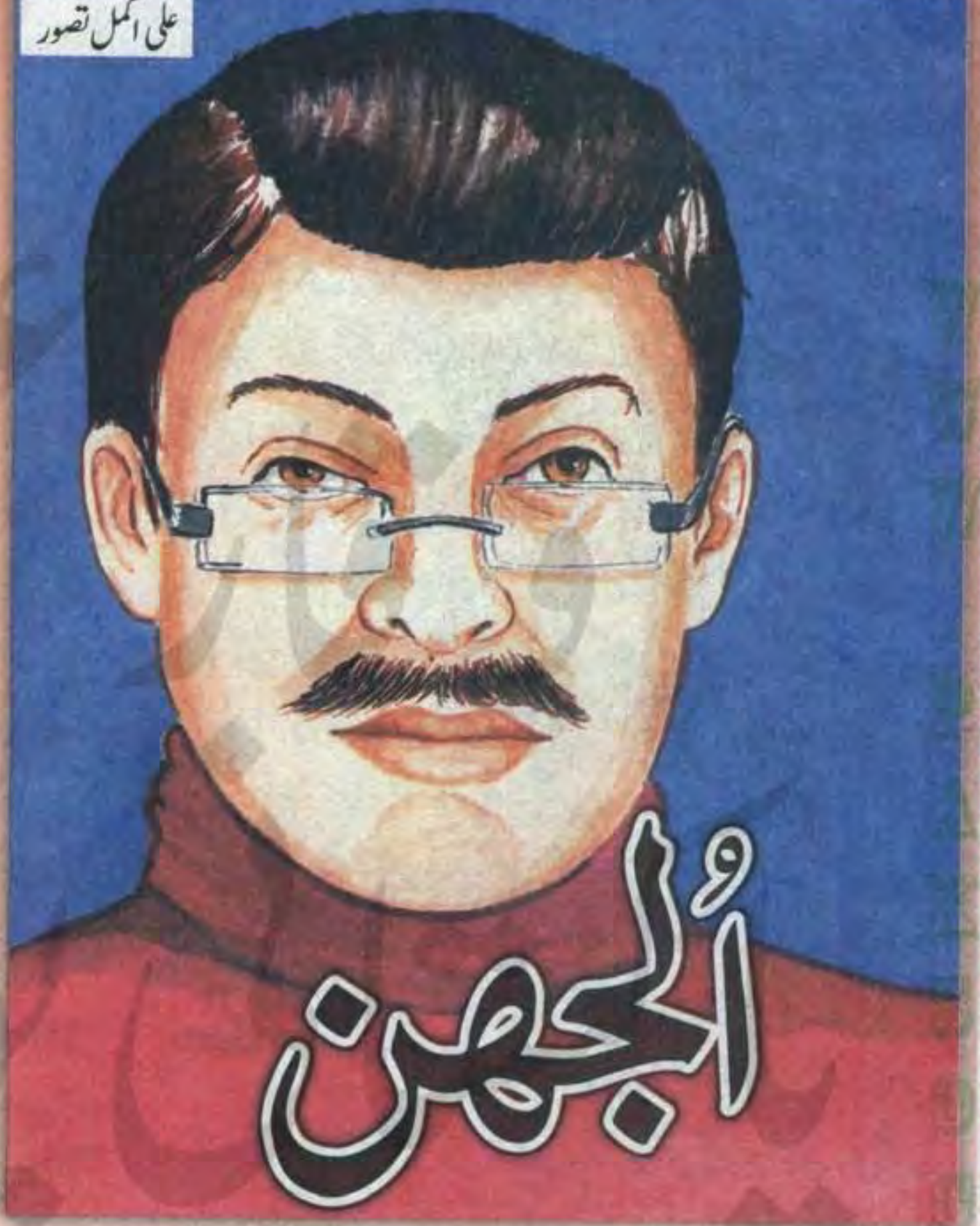
نام _____ شہر _____
مقاصد _____

فوری کے موضوع ”شیر کی تصویر“ ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 جنوری 2013ء ہے۔

ہونہار مصور

نام _____ عمر _____
مکمل پتہ: _____

علی اکمل تصور



پاس اس الجھن کا کوئی حل نہیں تھا۔ سکول کی انتظامیہ بھی اس الجھن کے حوالے سے بے بس نظر آتی تھی۔ میرا معمول یہ تھا کہ چھٹی کے وقت اپنی بیگم کو ساتھ لے جاتا تھا۔ سکول میں خواتین اساتذہ بچوں کو پڑھاتی تھیں اس لیے مرد حضرات کا داخلہ سکول میں ممنوع تھا۔ میری بیگم سکول کے اندر چلی جاتی اور بچوں کو کھانا کھلا دیتی تھی۔ پھر بچے مجھے ملنے آتے تھے۔ اور ایک الجھن مجھے گھیر لیتی تھی۔

میرے اور بچوں کے درمیان روزانہ ایک ہی طرح کے سوال و جواب ہوتے تھے۔ نہ وہ اصرار کرنے سے باز آتے تھے اور نہ میں انہیں سمجھاتے ہوئے تھکتا تھا۔ اور اب وہی سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔

اعظم اور صباحت نے یونیفارم تبدیل کر لیا تھا۔ اور اب وہ گھر کے کپڑوں میں نظر آ رہے تھے۔ وہ سکول کے بیرونی گیٹ سے نکلے تھے اور مجھ سے آ کر لپٹ گئے تھے۔

”تم دونوں ٹھیک ہونا؟“ میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا تھا۔
”جی ابو جی!“ وہ مسکرا رہے تھے۔ میرے دل میں سکون کی لہر ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کی مانند اتر گئی۔

”ابو جی..... ہمیں چیز لینی ہے.....“ اعظم بولا۔

”مجھے بھی.....“ صباحت بھی بولی۔

”کیا لینا ہے؟ یہاں تو کچھ بھی کھانے کے قابل نہیں ہے.....“ میں سنجیدہ ہو گیا۔

”ابو جی! اتنی ساری چیزیں تو ہیں۔ وہ دیکھیے۔ گول گپے والا..... اس کا املی کا بنایا کھٹا پانی کتنا مزے دار ہوگا.....“ اعظم منہ میں پانی بھر کر بولا۔

”بیٹا! املی کا تو صرف نام ہے۔ اس نے پانی میں ٹاٹری ملا رکھی ہے۔ گلا خراب ہو جائے گا.....“ میں بولا۔

”تو پھر آلو چاٹ لے دیجیے.....“ اعظم نے کہا۔

”بیٹا! سارے دن کی دھوپ اور آلودگی سے آلو چاٹ میں

سکول میں چھٹی ہونے کی گھنٹی بجی تو بچے شور مچاتے باہر کی طرف بھاگے۔ وہ تو سکول کی انتظامیہ برآمدوں میں بچوں کو نظم و ضبط کا پابند رکھنے کے لیے کھڑی تھی ورنہ بچے تو ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے بیرونی گیٹ سے باہر نکل جاتے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ گیٹ کے باہر اتوار بازار کا منظر نظر آتا تھا۔ بچوں کے والدین کا ہجوم، ٹھیلے والوں کی آوازیں، بچوں کا شور..... اور میں..... میں یہ بھی اس ہجوم کا حصہ تھا۔ میرے دو بچے اس سکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ بلکہ سکول ٹائم کے بعد وہ ٹیوشن بھی اسی سکول میں پڑھ رہے تھے۔ جب سے بچے اس سکول میں آئے تھے میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ بچوں کو صبح سکول چھوڑ کر آنا۔ دوپہر کو چھٹی کے وقت انہیں کھانا پہنچانا اور پھر شام کو پانچ بجے انہیں گھر لے کر آنا۔

بچوں کو یہاں اچھی بنیادوں پر تعلیم مل رہی تھی اور میں سکول کی انتظامیہ سے خوش تھا۔ الجھن صرف ایک بات کی تھی۔ میرے

جراثیم پیدا ہو چکے ہیں۔ تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ میں نے انکار کر دیا۔

”تو پھر آلو والے گرما گرم چپس لے دیجیے۔“ اعظم نے ایک پٹھان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تیل میں آلو کی چپس تل رہا تھا۔ میں نے یہاں بھی انکار کر دیا۔

”تو پھر مکئی کا بھٹہ لے دیجیے.....“ یہ اعظم کی آخری پسند تھی۔ مجھے اب غصہ آنے لگا تھا۔

بیٹا! گرمی بہت ہے۔ بھٹہ کھا کر پیاس لگے گی۔ تم پانی پیو گے تو پیٹ میں درد ہو گا.....“

”جائیے ابو جی..... آپ چاہتے ہی نہیں ہیں کہ ہم کوئی مزے دار چیز کھائیں.....“ وہ مجھ سے روٹھ کر سکول کے اندر چلا گیا تھا۔ صباحت اُس کے ساتھ تھی۔ میرے ہونٹوں پر افسردہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بچے نادان ہوتے ہیں۔ والدین کی احتیاط اُن کی صحت کے لیے ہوتی ہے۔ والدین کا پیار اُن کی سلامتی کے لیے ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ والدین انہیں پابندیوں کی بندگلی میں قید کر رہے ہیں۔ یہی میری اُلجھن تھی۔ میں چاہتا تھا کہ سکول کے باہر یہ

مضر صحت چیزیں فروخت نہ ہوں، لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے کسی کو روزی کے حصول میں مشکل پیش آئے۔ دن یونہی گزر رہے تھے۔ اور پھر ایک دن مجھے ایک کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا پڑا۔ اُس دن ہم نے بچوں کا کھانا ٹفن میں پیک کر دیا اور میں نے اپنے بچوں کو ہدایت کی کہ سکول کے باہر سے کچھ مت لے کر کھانا۔ انہیں جیب خرچ بھی نہیں دیا۔ میں نے سکول کی انتظامیہ سے بھی کہہ دیا کہ بچوں کو سکول سے باہر مت نکلنے دیجیے گا۔

بچوں کے حوالے سے میرا دل مطمئن ہو چکا تھا۔ میں نے وقت پر اپنا کام مکمل کر لیا اور شام کو ٹھیک پانچ بجے بچوں کو لینے سکول بھی پہنچ گیا تھا۔ بچے آئے تو میں نے دیکھا وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خوش تھے۔ وہ بات بات پر ہنس رہے تھے، کھیل رہے تھے۔ انہیں خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہو گیا۔ پریشانی مجھے تب ہوئی جب بچوں نے

رات کا کھانا ٹھیک طرح سے نہیں کھایا۔

”بچو! طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ابو جی!“ دونوں ایک ساتھ بولے۔ میں مطمئن ہو گیا۔ اگلی صبح میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں کچھ سست ہیں۔ میں معمول کے مطابق انہیں سکول چھوڑ آیا۔ گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں اپنے کام میں مصروف تھا کہ میرے موبائل پر ایک کال آئی۔ وہ سکول کا نمبر تھا۔ نمبر دیکھتے ہی میں پریشان ہو گیا۔

”جی..... سب خیریت تو ہے؟“ میں نے خوف کے عالم میں پوچھا۔ دوسری طرف پرنسپل صاحبہ تھیں۔

”آپ کے بچوں کی طبیعت خراب ہے.....“

اب میرا رکنا محال تھا۔ میں فوراً سکول پہنچا۔ دونوں بچے دفتر میں بیٹھے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں پانی تھا اور وہ بُری طرح کھانسنے لگے تھے۔ میں نے اُن کی پریشانی پر ہاتھ رکھا۔ انہیں ہلکا ہلکا بخار بھی تھا۔ میں انہیں اپنے محلے میں موجود ایک ڈاکٹر کے کلینک پر لے آیا۔ ڈاکٹر نے دونوں کو انجکشن لگایا اور پینے کے لیے کھانسی کا شربت دیا۔ اعظم خاموش تھا اور صباحت بھی کچھ بتا نہیں رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے، طبیعت کیسے خراب ہوئی، کیا کوئی مضر صحت چیز کھائی ہے؟“ میں مسلسل اصرار کر رہا تھا کہ وہ دونوں کوئی بات مجھے بتائیں، لیکن دونوں ہی خاموش تھے۔ اب شاید دوا کا اثر تھا کہ دونوں ہی



سو گئے، لیکن ہم میاں بیوی کی بے چینی کا جو عالم تھا وہ ہم ہی جانتے تھے۔ بچے سوتے میں بھی کھانس رہے تھے۔ یوں جیسے سینے میں ڈھول بج رہا ہو۔ دو گھنٹے اسی عالم میں گزر گئے۔ پھر اعظم اتنا کھانا اتنا کھانا کہ سوتے سے جاگ اٹھا۔ پھر وہ رونے لگا۔ تکلیف ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ کھانتے کھانتے اعظم نے قے کر دی۔ ہمارے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ اعظم بے سدھ ہو گیا تھا۔ میری بیوی رونے لگی تھی۔ عجیب آزمائش کا عالم تھا۔ دونوں بچوں کا بخار بھی اب بہت تیز ہو گیا تھا۔ میں اکیلا ان دونوں کو ہسپتال لے جانے کے قابل نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ایسبولینس منگوا لی۔ دونوں بچے نقاہت سے پور تھے، لیکن بے بس آنکھوں سے تمام مناظر دیکھ رہے تھے۔

ایمرجنسی میں ڈاکٹر نے پوری توجہ سے بچوں کا چیک اپ کیا۔ اور پھر ابتدائی طبی امداد کا عمل شروع ہوا۔ اعظم کو آکسیجن لگائی گئی تھی۔ اور ساتھ ہی ان دونوں کو انجکشن لگائے جا رہے تھے۔ سوئی چبھتی تھی تو دونوں تکلیف سے چیختے تھے۔ اور اُن کی چیخ کسی تیز دھار خنجر کی مانند میرے دل کو چیرتی تھی۔ وہ رات ہم نے ہسپتال میں گزاری تھی۔ اگلی صبح بچوں کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ ہمیں گھر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ میرے ذہن میں کچھ شکوک تھے۔ بچوں کی طبیعت اچانک اتنی زیادہ خراب کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر انہوں نے کوئی غلط چیز کھائی ہے تو پیسے کہاں سے آئے؟ ان حالات میں بچوں سے کوئی بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ اگلے تین دن میں وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکے تھے۔ میرے کام کا حرج ہوا تھا وہ علیحدہ بات تھی، لیکن بچوں کی تعلیم بھی متاثر ہو رہی تھی۔ اس بات کی مجھے زیادہ فکر تھی۔ اس بات کا احساس شاید اعظم کو بھی تھا۔ تب ہی تو وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ پانچویں دن میں انہیں پھر سے سکول چھوڑ آیا۔ میری بیگم مجھ سے صرف ایک سوال پوچھتی رہی کہ آپ بچوں سے اُن کی طبیعت کی خرابی کی وجہ کیوں نہیں پوچھتے۔ آپ انہیں ڈانٹتے کیوں نہیں..... اور میں اُسے صرف ایک جواب دیتا تھا۔

”اعظم کی آنکھوں میں مجھے غلطی کا احساس نظر آ رہا ہے۔

وہ اپنی غلطی کا اعتراف خود کرے گا اور جب غلطی تسلیم کرنے کا شعور آ جائے تب ڈانٹ کی یا پھر سزا کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی.....“ اور پھر وہی ہوا۔ دوپہر کو ہم دونوں بچوں کا کھانا لے کر سکول پہنچے۔ میری بیگم سکول کے اندر چلی گئی۔ اب میں باہر کھڑا اپنے بچوں کا انتظار کر رہا تھا۔ سکول کے باہر وہی ماحول تھا۔ والدین کی آمد و رفت..... بچوں کا شور اور ٹھیلے والوں کی آوازیں۔

”پاپڑ..... کھٹے میٹھے پاپڑ.....“

”گول گپے..... مزے دار گول گپے.....“

”بھٹے والا..... بھٹے والا.....“

”آلو چاٹ..... سات مصالحوں والی آلو چاٹ.....“

میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ پھر میں نے اعظم اور صباحت کو آتے دیکھا۔ اُن کے سر جھکے ہوئے تھے۔ وہ میرے قریب پہنچے تو میں نے کہا۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ آج میں اپنے بچوں کو کوئی مزے دار

چیز کھلاؤں..... چلو آلو چاٹ کھاتے ہیں.....“

”نہیں ابو جی!“ اعظم روہانسا ہو گیا۔

”تو پھر گول گپے کھا لو..... نہیں..... آلو والے چپس تو کھا ہی سکتے ہو۔“ میری باتیں سن کر دونوں میری ٹانگوں سے چٹ کر رونے لگے۔

ابو جی! ہمیں معاف کر دیجیے۔ آپ کی بات نہ مان کر ہم نے غلطی کی، اُس دن ہم نے جی بھر کر یہ تمام چیزیں کھائیں تھیں۔ گزشتہ ایک ہفتے کا جیب خرچ میں نے جمع کر رکھا تھا۔ اسی لیے تو ہم بیمار ہوئے تھے اور آپ کو بھی پریشان کیا تھا۔“

”نہیں بیٹا! والدین اپنے بچوں کی وجہ سے کبھی پریشان نہیں ہوتے۔ اُن کا ہر عمل اپنے بچوں کو دکھ اور تکلیف سے بچانے کے لیے ہوتا ہے.....“ اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بعد میرے بچوں کے دل پر پڑا بوجھ اب ہٹ چکا تھا۔ پھر وہ اچھلتے کودتے سکول کے اندر چلے گئے۔ اور میری اُلجھن دور ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اب میرے بچے دوبارہ کبھی کوئی مضر صحت چیز نہیں کھائیں گے۔

☆☆☆☆



عائشہ جواد، اسلام آباد
میں ڈاکٹر بن کر اپنے والدین کا نام
روشن کروں گی۔



کشمالہ بلوچ، لاہور
میں استانی بن کر طالبات کو تعلیم کے
زیور سے آراستہ کروں گی۔



ماہ نور عامر، لاہور
میں سائنس دان بن کر ملک و قوم کی
خدمت کروں گی۔



محمد بلال، تاندلیا نوالہ
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے ملک
اور والدین کا نام روشن کروں گا۔



مریم نایاب، نوشہرہ
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج
کروں گی۔



فاطمہ بیگ، لاہور
میں مصورہ بن کر خوب صورت
تصویریں بنانا چاہتی ہوں۔



محمد عاصم رضا، لاہور
میں پاک آرمی میں جا کر ملک کی
سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔



شیخ علی وارث، اوکاڑہ
میں پاکستان آرمی میں جا کر ملک و قوم
کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔



رضوان اللہ، دیر
میں سائنس دان بن کر ملک و قوم کی
خدمت کروں گا۔



ملک عرفان رقی، پنڈو وادی خان
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے
والدین کا نام روشن کروں گا۔



احمد کمال، لاہور
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے
والدین کا نام روشن کروں گا۔



محمد احمر چوہدری، راولپنڈی
میں انجینئر بن کر اپنے ملک اور
والدین کا نام روشن کروں گا۔



سباحت احمد، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج
کروں گی۔



محمد اسید خالد ملتان
میں اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی
زندگی وقف کرنا چاہتا ہوں۔



محمد سجاد حیدر، ملتان
میں فوجی بن کر اپنے پیارے وطن کی
سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔



بھدرمان شرف، ملتان
میں پولیس آفیسر بن کر اپنے
پیارے وطن سے جرائم کا خاتمہ
کروں گا۔



عبدالودود، واہگینٹ
میں اسلام کے دشمنوں کے خلاف
جہاد کرنا چاہتا ہوں۔



صدقت علی رلاہو
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی
خدمت کروں گا۔



آمنہ یاسر، مری
میں استانی بن کر چھار سو علم کی روشنی
پھیلاؤں گی۔



فتح محمد شارق، نوشہرہ
میں ڈاکٹر بن کر اپنے والدین کے
خواب کو حقیقت کا روپ دینا چاہتا
ہوں۔



حسان بدر، پورے والا
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے ملک
اور والدین کا نام روشن کرنا چاہتا
ہوں۔



مبین احمد شفقت، لاہور
میں پولیس آفیسر بن کر عوام کی
خدمت کروں گا۔



ماہ شاہد، لاہور
میں استانی بن کر قلمی تعلیمی ادارہ بنا
کر طالبات کو مفت تعلیم دوں گی۔



آمنہ اظہار، حیدرآباد
میں خلا باز بن کر پاکستان کا نام روشن
کرنا چاہتی ہوں۔



عبدین سجاد، گوجرانوالہ
میں بڑی ہو کر استانی بن کر علم کی
روشنی پھیلاؤں گی۔



300 کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ حال ہی میں فرانس نے بھی 320 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی ٹرین متعارف کروائی ہے۔ برصغیر میں 1847ء میں پہلی ریل کی پٹری بچھائی گئی تھی۔ 1861ء میں پہلی ٹرین سروس کراچی سے کوٹری کے لیے شروع ہوئی تھی۔ ٹرین جیسی سواری پر متعدد فلمیں، ڈرامے بھی بنائے گئے ہیں اور اس پر گانے بھی لکھے گئے ہیں۔

ٹیبیل ٹینس

ٹیبیل ٹینس (Table Tennis) کو "Ping Pong" بھی کہا جاتا ہے یہ کھیل 2 سے 4 کھلاڑی کھیلتے ہیں۔ اس کھیل کے قوانین انٹرنیشنل ٹیبیل ٹینس فیڈریشن (ITTF) طے کرتی ہے۔ جس کے 217 ممالک ممبرز ہیں۔ 1988ء سے یہ کھیل اولمپکس میں شامل ہوا۔ اس کھیل کا آغاز 1880ء کی دہائی میں برطانیہ



سے ہوا۔ آغاز میں یہ امراء کا کھیل تھا۔ اس کھیل کی گیند 2.7 گرام وزنی، سفید یا اورنج رنگ کی ہوتی ہے۔ اس کا ڈایا میٹر پہلے 38 ملی میٹر تھا، لیکن اب 48 ملی میٹر ہوتا ہے۔ اولمپکس 2000ء میں پہلی بار 48 میٹر قطر کی گیند استعمال ہوئی۔ گیند پر تین ستارے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب سے اچھی گیند ہے۔ اس کھیل کی میز 9 میٹر لمبی اور 1.52 میٹر چوڑی ہوتی ہے۔ میز زمین سے 76 سینٹی میٹر (30 انچ) بلند ہوتی ہے۔ جس کے درمیان میں 15.25 سینٹی میٹر (6 انچ) بلند جال (Net) لگا ہوتا ہے۔ اس کھیل کے ریکٹ (Racket) کی لمبائی 16.5 سینٹی میٹر اور



ڈاکٹر طارق ریاض خان

ٹرین

ٹرین (Train) یا ریل گاڑی ایک اہم سواری ہے۔ اردو زبان میں ٹرین کے لیے "قطار" کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ ابتداء میں لکڑی کی ٹرین بنائی گئی تھی جسے گھوڑے کھینچتے تھے۔ 17 ویں صدی



کے آخر میں برطانوی ماہر ولیم جیسپ (William Jessup) نے ایسی بوگیاں تیار کی تھیں جو پٹریوں پر گرفت کے ساتھ بھاگ سکتی تھیں۔ برطانوی انجینئر رچرڈ ٹریفٹھک (Richard Trevithick) نے سیٹم لوکوموٹیو انجن بنایا تو ایک انقلاب آ گیا۔ 1804ء میں پہلی بار انجن کی مدد سے ٹرین چلائی گئی۔ اس ٹرین پر 70 افراد اور دس ٹن لوہا موجود تھا۔ 1820ء میں حمیز واٹ کے بنائے بھاپ کے انجن ٹرین میں استعمال ہونے لگے۔ 1881ء میں جرمنی نے پہلی الیکٹرک ٹرین چلائی تو سفر مزید تیز اور آسان ہو گیا۔ دنیا کی بہترین ٹرین ٹوکیو سے اوسکا کے درمیان چلتی ہے، جس کی رفتار

چوڑائی 15 سینٹی میٹر ہوتی ہے جو لکڑی کا بنا ہوتا ہے۔

مسیح وفات پائی تھی۔

ارسطو

نیولا

ارسطو (Aristotle) ایک عظیم یونانی فلاسفر تھا۔ جو افلاطون

نیولا (Mongoose) سانپ کو کاٹ ڈالنے والا جانور ہے۔

(Plato) کا شاگرد اور سکندر اعظم کا استاد تھا۔ وہ طبیعیات، اس کی 33 اقسام ہیں۔ یہ بنیادی طور پر گوشت خور جانور ہے۔ جو مینافزکس، شاعری، تھیٹر، میوزک، منطق، زبان دانی، سیاست، افریقہ، ایشیاء اور جنوبی یورپ میں پایا جاتا ہے۔ قدیم مصری سانپوں



حکومت، اخلاقیات، حیاتیات، حیوانیات اور نباتیات کا ماہر تھا۔ یونانی زبان میں ارسطو یعنی Aristotle کا مطلب ہے ”بہترین مقصد“، سے 4 فٹ جب کہ وزن 10 اونس (280 گرام) سے 9 پاؤنڈ ارسطو 384 قبل مسیح یونان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد کا نام (4.1 کلو گرام) ہو سکتا ہے۔ نیولے کی چند اقسام تنہا اور چند گروہ Nicomachus تھا۔ جو مقدونیہ کے بادشاہ "Amyntas" کا کی صورت میں رہتی ہیں۔ یہ سانپ کا سر کاٹ ڈالتے ہیں کیوں کہ ذاتی معالج تھا۔ اسی لیے ارسطو نے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں امراء ان کے دانت بہت تیز ہوتے ہیں۔ ان کے جسم میں ایک ایسا کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ 18 برس کی عمر میں ارسطو افلاطون کا کیمیائی مادہ پیدا ہوتا ہے جو اسے سانپ کے زہر سے بچاتا ہے۔ شاگرد بنا۔ ارسطو نے سائنسی علوم کے علاوہ منطق میں بھی کمال سانپ نہ ملے تو یہ چھوٹے پرندے، حشرات، کیڑے، کیچوے، حاصل کیا۔ وہ یونان میں 20 برس رہا اور اپنی علمی پیاس بجھاتا رہا۔ چھپکلیاں، چوزے اور گلہریاں بھی کھا جاتے ہیں۔ دُنیا بھر میں اس ارسطو کی شادی Pythias نامی خاتون سے ہوئی۔ اُس کی ایک جانور پر متعدد ناول لکھے گئے ہیں۔

☆☆☆☆

مختصر معلومات

(حسان بدر، بورے والا)

- پاکستان کا قومی کھیل ہاکی ہے۔
- پاکستان کا قومی لباس شلوار قمیص ہے۔
- پاکستان کی قومی زبان اُردو ہے۔
- پاکستان کا قومی ترانہ حفیظ جالندھری نے لکھا ہے۔

- پاکستان کا قومی پرندہ چکور ہے۔
- پاکستان کا قومی جانور مارخور ہے۔
- پاکستان کا قومی پھول چنبیلی ہے۔
- پاکستان کا قومی مشروب گنے کا رس ہے۔

*** کھیل دس منٹ کا ***

ذ	ل	م	ز	م	د	س	ی	ل	غ
ث	ک	ش	ا	ڈ	ی	ب	آ	ب	ج
ص	ا	د	ق	ل	ف	ش	گ	م	ن
ر	ت	ا	ر	ا	ر	ی	م	ل	ی
ع	ا	ق	ب	ن	ص	ر	د	ع	م
ل	ن	ز	ی	ر	ا	خ	ث	ت	ظ
ق	س	م	ض	ع	ن	ب	ر	گ	و
ع	ل	ن	ی	ک	ا	م	ل	ح	م
و	ن	ی	ر	ن	ی	م	ا	ط	ص
ش	ل	ر	ی	ت	ح	گ	ع	ش	ے

آپ نے حروف ملا کر حضور ﷺ کے دس مبارک صفاتی نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان مبارک صفاتی ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن مبارک صفاتی ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

صادق، امین، منزل، مدثر، کامل، بشیر، نذیر، منیر، ناصر، عاقب

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 جنوری 2013ء ہے۔



دسمبر 2012ء کے ”بلا عنوان کارٹون“ کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلس ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

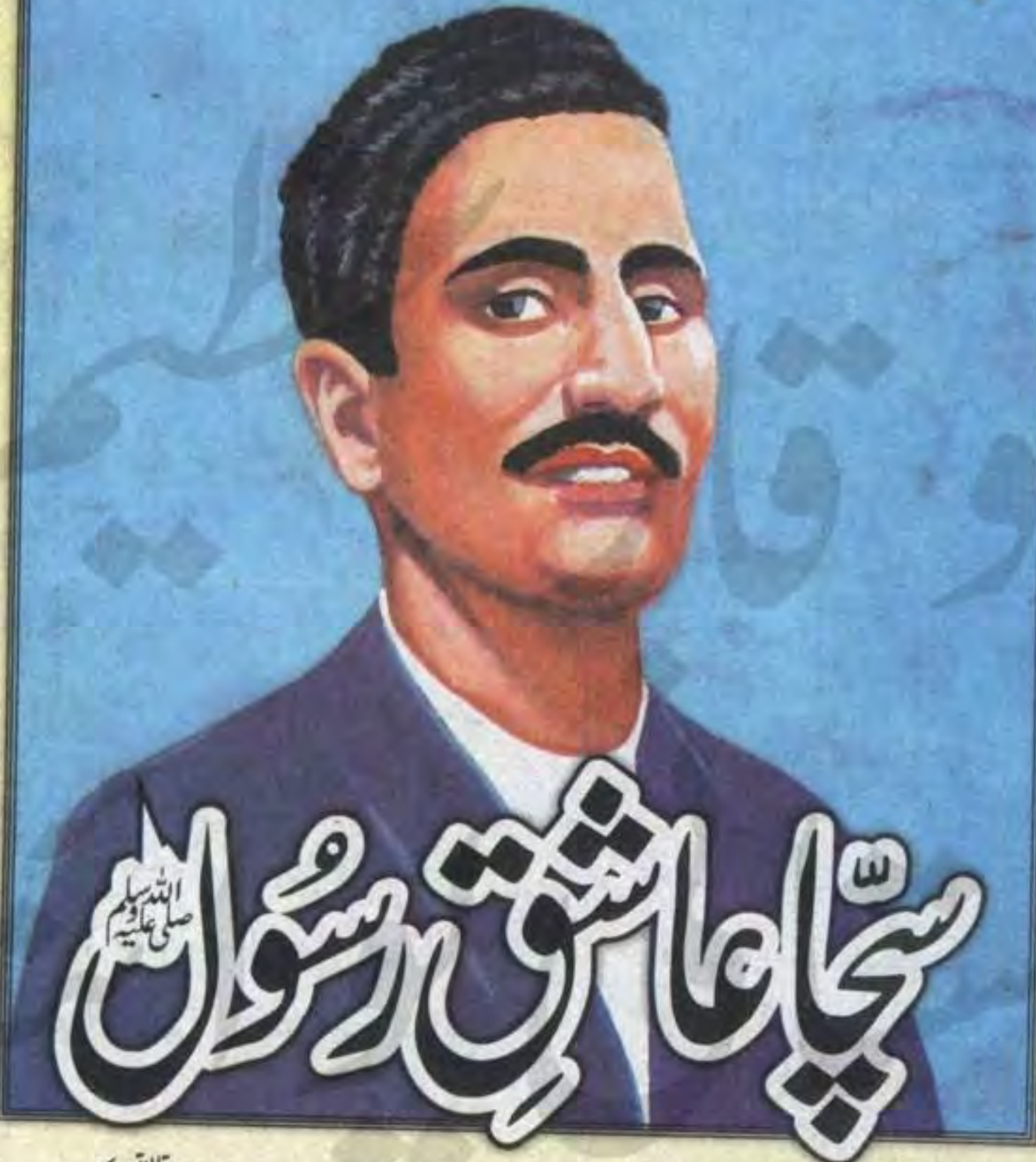


(زین منیر، لالہ موسیٰ)
(خدیجہ نشان، کاموکی)
(مصباح نور، اوکاڑہ)
(عمار احمد، فیصل آباد)
(راشد محمود، اسلام آباد)

▶ چلو بھاگو، بڑا شیر بنا پھرتا تھا۔
▶ سب دیکھ لو! آج سے جنگل کے بادشاہ ہم ہیں۔
▶ دیکھا ہے پہلی بار، شیر پر بندر سوار۔
▶ ناممکن کو ممکن بنانا کوئی ہم سے سیکھے۔
▶ یاد رکھو، دشمن کو کبھی کمزور نہ سمجھو۔

سچی کہانی

محمد فہیم عالم



اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی، اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، اُس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اُس نے مدھم ہوتے ہوئے ستاروں کی طرف دیکھا۔ چاند کی بارہ تیرہ تاریخ تھی۔ وہ اس منظر میں کھوسا گیا۔ اچانک وہ چونک اٹھا۔ اُسے یاد آیا کہ وہ تو گہری نیند سویا ہوا تھا۔ پھر اچانک بیدار کیسے ہو گیا۔

”اوہ..... تو وہ خواب تھا۔“ اُس کے منہ سے نکلا۔ اُسے اپنے آنکھ کھلنے کی وجہ معلوم ہو گئی تھی۔ اُس نے کروٹ بدلی اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن نیند تو جیسے اُس سے روٹھ ہی گئی تھی۔ باوجود کوشش کے وہ دوبارہ سو نہیں سکا۔ یونہی بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے صبح ہو گئی۔ اُس کے ذہن میں بار بار خواب کے الفاظ گونج رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”عاشق رسول ﷺ ہونے کا دعویٰ کرنے والے مسلمانو! کیا تمہیں معلوم نہیں آج گنبدِ خضریٰ میں رسول ﷺ تڑپ رہے ہیں۔ مسلمانو.....! آج حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پریشان ہیں۔“

ان الفاظ نے اُس کے قدم جکڑ لیے اور وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ سامنے بیرونِ دہلی دروازے پر واقع احاطہ درگاہ شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ میں لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ سیٹج پر علماء کرام کی ایک بڑی تعداد

موجود تھی۔ جب کہ ایک بارعب، وجیہہ صورت اور روشن چہرے والے عالم تقریر کر رہے تھے۔ ”بھائی صاحب! یہ یہاں جلسہ کیوں ہو رہا ہے؟“ اُس نے پاس کھڑے ایک آدمی سے پوچھا۔

”کیا.....!“ اُس آدمی نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

”کیا آپ کو معلوم نہیں یہاں لاہور کے ایک ملعون پبلشر راج پال نے ایک کتاب چھاپی ہے، جس

میں ہمارے پیارے نبی ﷺ کی شان میں گستاخانہ الفاظ لکھے گئے ہیں۔“

”کیا.....!!“ یہ سن کر وہ چلا اٹھا۔ مارے غم و غصہ کے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”جی ہاں.....! آج کا یہ جلسہ اسی سلسلے میں ہو رہا ہے۔ حالاں کہ آج لاہور میں دفعہ 144 نافذ ہے۔ جس کی رو سے لاہور میں کوئی جلسہ یا اجتماع نہیں ہو سکتا۔“ وہ آدمی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”لیکن حکومت نے یہ دفعہ کیوں نافذ کی ہے؟“ اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”کیوں کہ حکومت انگریزوں کی ہے۔ وہ تو مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ وہ بھلا کب چاہیں کہ مسلمان اُس ملعون راج پال کی اس گستاخی پر کسی ردِ عمل کا اظہار کریں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ حکومت اس ناشائستہ حرکت کرنے والوں کو سزا دیتی، لیکن حکومت تو

الٹا ملعون راج پال کو تحفظ فراہم کر رہی ہے۔ حکومت کے اس دوغلے پن نے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔ ہندوستان کے تمام مسلمان اس گستاخی پر سراپا احتجاج بن چکے ہیں۔“ وہ آدمی بولتا چلا گیا۔

”تو پھر مسلمان عدالتوں یا حکومت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی بجائے خود اُس ملعون کو اس ناپاک جسارت کی سزا کیوں نہیں دے دیتے؟“ تمام تفصیلات جان کر اُس کا خون کھولنے لگا تھا۔

”دو مرتبہ یہ کوشش کی جا چکی ہے۔ خدا بخش نامی ایک دودھ بیچنے والے نے اُس ملعون پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ حملہ ناکام رہا۔ وہ صرف زخمی ہوا۔ خدا بخش گرفتار ہو گیا۔ عدالت نے اُسے سات سال قید کی سزا دی ہے۔ چوں کہ اب یہ معاملہ صرف یہاں ہندوستان میں ہی نہیں بل کہ ہندوستان سے باہر بھی سب مسلمانوں کو پتہ چل گیا ہے۔ افغانستان کے ایک غیور مسلمان عبدالعزیز نے اُس ملعون راج پال پر حملہ کیا، مگر حملہ کر کے اُس نے جس شخص کا سرتن سے جدا کیا تھا۔ وہ ملعون راج پال کا دوست جتندر داس نکلا تھا۔ عبدالعزیز بھی گرفتار ہو گیا۔ عدالت نے اُسے 14 سال قید کی سزا سنائی ہے۔ ان دو حملوں کے بعد حکومت نے اُس کی سکیورٹی اور بھی سخت کر دی ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ آدمی خاموش ہو گیا۔ یہ سب باتیں سن کر اُس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

”جب تک ایک مسلمان بھی زندہ ہے۔ ناموس رسالت ﷺ پر حملہ کرنے والے چین سے نہیں رہ سکتے۔“ اُس نے سنا مولانا صاحب کہہ رہے تھے۔

”یہ..... یہ..... مولانا صاحب کون ہیں.....؟“ اُس نے سوال کیا۔

”ارے..... کیا تم انہیں نہیں جانتے.....؟“ اُس آدمی نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”یہ ہندوستان کے مشہور خطیب اور مقرر عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ جن کی تلاوت کا شیدائی تو پنڈت جواہر لال نہرو بھی ہے۔“

”اچھا.....!“ اُس نے تعجب سے کہا۔

جلسہ ختم ہوا تو وہ گھر چلا آیا۔ اُس کے ذہن میں عطاء اللہ شاہ

بخاری کی تقریر کے الفاظ اور جلسے میں ملنے والے شخص کی بتائی ہوئی باتیں گونج رہی تھیں۔ گھر آنے میں اُسے خاصی تاخیر ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک شریف انسان تھا۔ پیشے کے لحاظ سے اُس کا والد طالع مند ایک ترکھان (برہمن) تھا۔ طالع مند ترکھان کا یہ چھوٹا بیٹا علم الدین بہت سادہ طبیعت اور اپنے کام سے کام رکھنے والا تھا۔ زندگی بہت ہی امن اور چین سے گزر رہی تھی۔ بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اب علم الدین کی باری تھی۔ اس کی ماموں کی بیٹی سے منگنی ہو چکی تھی۔ وہ چوں کہ ایک ان پڑھ اور دیہاتی سا آدمی تھا۔ اس لیے اپنے پیارے نبی ﷺ کے بارے میں واجبی سے معلومات ہی رکھتا تھا۔

☆.....☆.....☆

شیدے یار! کل رات میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔“ صبح اٹھ کر وہ اپنے دوست شیدے کے پاس گیا۔

”خواب دیکھا ہے.....! کیا مطلب..... کیا خواب.....؟“ شیدے نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

”میں نے دیکھا کہ نورانی شکل و صورت والے ایک سفید پوش بزرگ میرے پاس آئے اور بولے:

”اٹھو علم الدین! کفار تمہارے پیارے نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کر رہے ہیں۔ اور تم ابھی تک سو رہے ہو۔ اٹھو.....!“

جلدی کرو، انہوں نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔“ علم الدین تفصیل سے اپنا خواب بتاتے ہوئے بولا۔

”کیا.....“ اُس کا خواب سن کر شیدے نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

”کیا تم نے واقعی یہ خواب دیکھا ہے؟“

”ہاں یار! میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

”لیکن..... لیکن..... بالکل یہی خواب تو میں نے بھی دیکھا ہے۔“

”کیا.....!!“ اب حیران ہونے کی باری علم الدین کی تھی۔

”جی ہاں.....! میں تو ارادہ بھی کر چکا ہوں کہ ان شاء اللہ

عنقریب اُس ملعون راج پال کو جہنم رسید کروں گا۔“ شیدا پُر عزم لہجے میں بولا۔

”نہیں یار! میں چاہتا ہوں کہ وہ شیطان صفت انسان میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے۔“ علم الدین نے کہا۔
”نہیں..... نہیں..... میں۔“ شیدا چلا کر بولا۔

کافی دیر تک اُن کے درمیان یہ بحث جاری رہی، لیکن کوئی بھی اس سعادت سے برطرف ہونے کو تیار نہ تھا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ قرعہ نکالا جائے۔ تین مرتبہ قرعہ نکالا گیا۔ ہر مرتبہ علم الدین ہی کا نام نکلا۔ اب تو شیدے کے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ علم الدین کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مارے خوشی کے وہ پھولا نہ سما رہا تھا۔ اُسی رات پھر اُسے وہی نورانی صورت والے بزرگ نظر آئے وہ بولے:

”علم الدین! اٹھو! جلدی کرو۔ اگر تم نے دیر کر دی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اور بازی لے جائے۔“

صبح اٹھ کر وہ دوڑا دوڑا شیدے کے پاس پہنچا۔
”یار شیدے! آج پھر وہ پہلے والا خواب مجھے نظر آیا ہے۔ میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ ان شاء اللہ کل ہی اُس ملعون کا کام تمام کر دوں گا۔“

اُس کے لہجے میں چٹانوں کی سی مضبوطی تھی۔ اُس نے اپنی گھڑی شیدے کو یادگار کے طور پر تھمائی اور اپنے گھر چلا آیا۔ سارا دن اُس کی طبیعت میں عجیب سی بے چینی رہی۔ اُس رات وہ دیر تک جاگتا رہا۔ اُسے نیند آتی بھی کیسے، کل صبح وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے مشن پر جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

جیسے ہی صبح ہوئی وہ بستر سے اٹھا اور گھر سے نکل کر گٹی بازار میں واقع آتمارام کباڑیئے کی دکان کا رخ کیا۔

وہاں سے ایک تیز دھار چھری خریدی۔ چھری کو اپنے کپڑوں میں اڑیس کر وہ راج پال کے دفتر کی طرف چل دیا۔ ہسپتال روڈ پر عشرت پبلشنگ ہاؤس کے سامنے ہی راج پال کا دفتر تھا۔ وہ ہندو آریہ سماج کی مذہبی کتابیں چھاپتا تھا۔ آپ ﷺ کے حوالے سے

گستاخانہ کتاب ”رنگیلا رسول“ (نعوذ باللہ) بھی اُسی نے شائع کی تھی۔ دفتر کے سامنے پہنچ کر اُس نے معلومات حاصل کیں تو اُسے معلوم ہوا کہ راج پال ابھی تک دفتر میں نہیں آیا۔ جیسے ہی وہ دفتر آتا ہے۔ پولیس کا ایک مسلح دستہ اُس کی حفاظت کے لیے آ جاتا ہے۔ وہ ایک کھوکھے کے سامنے کھڑا ہو کر راج پال کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں ایک کار وہاں آ کر رکی۔ اور اُس میں سے ایک آدمی نکل کر دفتر کی طرف بڑھا۔

”یہی ہے وہ ملعون راج پال۔“ کھوکھے والے نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔ یہ سن کر وہ تیر کی طرح اُس کے پیچھے لپکا۔ راج پال اپنی کرسی پر بیٹھ کر پولیس کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ علم الدین اندر داخل ہوا۔ اس وقت راج پال کے دو ملازم وہاں موجود تھے۔ کیدار ناتھ پچھلے کمرے میں کتابیں رکھ رہا تھا جب کہ بھگت رام، راج پال کے پاس ہی کھڑا تھا۔ راج پال نے درمیانے قد کے اُس گندمی رنگ والے نوجوان کو اندر داخل ہوتے دیکھ تو لیا تھا، لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کی موت اُس کے اتنے قریب آ چکی ہے۔ علم الدین نے پلک جھپکنے میں چھری نکالی اور اُس ملعون کے ناپاک دل میں اتار دی، جس میں محسن کائنات ﷺ کے لیے بغض بھرا ہوا تھا۔ ایمان کے جذبے سے کیا گیا ایک ہی وار کارگر ثابت ہوا۔ راج پال کے منہ سے صرف ”ہائے.....!“ کی آواز نکلی اور وہ زمین پر جا پڑا۔ علم الدین جو کہ ملعون گستاخ رسول ﷺ کو جہنم رسید کر کے اب غازی علم الدین بن چکے تھے۔ اک شان سے چھری ہاتھ میں پکڑے دفتر سے باہر نکلے۔

”پکڑو.....! پکڑو.....! مار گیا۔“ کیدار ناتھ اور بھگت رام

پکارتے ہی رہ گئے۔ راج پال کے قتل کی خبر آنا فانا پورے شہر میں پھیل گئی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آئی تو کئی ہزار ہندو ہسپتال پہنچ گئے۔ غازی علم الدین کو گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت میں مقدمہ چلا۔ مقدمے کی پیروی قائد اعظم کر رہے تھے۔ مسلمان چاہ رہے تھے کہ حکومت غازی علم الدین کے اس اقدام کو درست قرار دے کیوں کہ راج پال نے حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کر کے

مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا تھا۔ قائد اعظم اس مجاہد کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس مقدمے میں 18 ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ جو مسلمانوں نے چندہ کر کے جمع کیے تھے۔ آخر 31 اکتوبر 1929ء کو غازی علم الدین کو پھانسی دے دی گئی۔ اور یوں غازی علم الدین، غازی سے شہادت کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ جیل حکام نے خاموشی سے غازی علم الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ کے جسدِ خاکی کو بغیر نماز جنازہ پڑھائے جیل کے اندر ہی دفن کر دیا۔ اور علاقے میں سخت پہرہ لگا دیا۔ حکومت کی اس حرکت پر مسلمان بھر گئے۔ اور ملک میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ حکومت کے لیے مظاہرے اور ہنگامے روکنا مشکل ہو گیا اور مجبوراً شہادت کے تیرہ دن بعد آپ کا جسدِ خاکی قبر سے نکال کر مسلمانوں کے حوالے کر دیا گیا۔ تیرہ دن گزرنے کے باوجود غازی علم الدین شہید کا جسم تروتازہ تھا۔ لاہور میں ان کا جنازہ پڑھایا گیا۔ تقریباً چھ لاکھ مسلمان اس جنازے میں شریک ہوئے۔ جنازے کا جلوس پانچ میل لمبا تھا۔ جنازہ جدھر سے بھی گزرتا پھولوں کی بارش ہونے لگتی۔ فضا میں خوش بو ہی خوش بو پھیلی ہوئی تھی۔ دُور دراز علاقوں سے آئے ہوئے مسلمان ”غازی علم الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ زندہ باد“ اور

”اسلام زندہ باد“ کے نعرے لگا رہے تھے۔ آپ کی قبر مولانا ظفر علی خان نے اپنی نگرانی میں بنوائی۔ وہ لحد میں اترے اور لیٹ کر لمبائی اور چوڑائی کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا دیر علی شاہ الوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاتھوں سے اس عاشقِ رسول ﷺ کو لحد میں اتارا۔

علامہ اقبالؒ جب بھی غازی علم الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کرتے تو آبِ دیدہ ہو جاتے اور کہتے۔

”اساں تے گلاں ای کر دے رہ گئے، تے او ترکھان دا پتر بازی لے گیا۔“ (ہم تو باتیں ہی کرتے رہ گئے، اور وہ ترکھان ”بڑھئی“ کا بیٹا بازی لے گیا۔)

لاہور کے معروف قبرستان میانی شریف میں واقع غازی علم الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ کا مزار آج بھی مسلمانوں سے شکوہ کناں ہے کہ اپنے زمانے کے گستاخِ رسول ﷺ کو تو میں نے جہنم واصل کر دیا تھا۔ تمہارے زمانے میں تو اس سے بھی بڑی گستاخی ہوئی ہے۔ تم خاموش تماشا کی کیوں بنے ہوئے ہو؟ اٹھو.....! اور دشمنوں کو بتا دو کہ اسلام کا دامن کبھی بھی غازی علم الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ جیسے مجاہدوں سے خالی نہیں رہا۔

☆☆

حضور ﷺ بحیثیت معلم

محسنِ انسانیت ﷺ کی زندگی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ قرآن مجید میں آپ ﷺ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن میں سے ایک پہلو آپ ﷺ کا معلم ہونا بھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“ قرآن مجید پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بحیثیت معلم اس طرح پیش کرتا ہے۔ ”یقیناً اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر یہ بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں ایک رسول ﷺ بھیجا جو انہیں آیاتِ قرآنی پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے اخلاق کو سنوارتا ہے، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے یہ لوگ کھلی گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے۔“ آپ ﷺ قیامت تک معلمِ انسانیت ہیں۔ معلمِ اعظم کی زندگی کا اہم مقصد ہی دُنیا میں علم و حکمت کو پھیلانا تھا، آپ ﷺ پوری کائنات کے لیے حکمت و دانائی کا پیغام لے کر آئے۔ دُنیا کو وہ درس دیا جس کی سچائی کی شہادت خود اللہ تعالیٰ دیتے ہیں، آپ ﷺ کو معلم بنا کر بھیجنے والی ہستی اللہ تعالیٰ ہی کی تو ہے۔ دُنیا کے جدید اور قدیم علوم آپ ﷺ ہی کی وجہ سے پھیلے۔ آپ ﷺ ہی اسلام کی پہلی یونیورسٹی کے معلمِ اعظم بنے۔ یہاں سے علم کا وہ چشمہ پھوٹا جس نے تمام دُنیا کے طالب علموں کی پیاس بجھائی، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کے فرشتے، زمین و آسمان کی ہر چیز حتیٰ کہ چیونٹی اور مچھلی بھی معلم کی بھلائی مانگتی ہے اور اس کے بعد مزید فرمایا کہ اگر کسی سے علم کے بارے میں کوئی بات پوچھی جائے اور وہ جانتے ہوئے بھی نہ بتائے تو قیامت کے روز اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

(محمد زبیر ارشد، ملتان)



گاہک تاجر ضروری ہے

حاصل کرتے تھے۔ شیر اور ریچھ جنگل کی حفاظت پر مامور تھے ان کے ہوتے ہوئے کوئی بھی شکاری وہاں نہیں آ سکتا تھا۔ لومڑی نے بھی اب مفت مشورے دینے چھوڑ دیئے تھے اس نے ایک ٹیلے پر اپنے اپنا دفتر کھول لیا تھا، دوسرے جانور اکثر اس کے پاس بیٹھے مفید مشورے لے رہے ہوتے اور فیس ادا کرتے۔ لکڑ بھگوں نے گوشت کی دکان کھول لی تھی۔ وہ دن بھر اپنے مضبوط جبروں سے ہڈیاں توڑتے رہتے، صبح کے وقت بہت سے جانور قطار بنائے وہاں سے گوشت خرید رہے ہوتے۔ اسی طرح پرندوں میں جنگلی کبوتروں نے پیغام رسانی کا اور بطخوں نے جنگل بھر کے کپڑے دھونے کا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ تمام دن تالاب پر چھینٹے اڑاتی رہتی تھیں۔ اگرچہ تمام جانور کوئی نہ کوئی کام کر رہے تھے، لیکن میاں جھینگر ابھی تک ان جھمیلوں سے آزاد تھے انہیں بس دو کام تھے ایک گھاس کی نوکیلی پتیوں سے لپٹ کر گیت گانا اور دوسرا آرام کرنا۔

ایک دن جب وہ اپنے معمول کے گشت پر نکلا تو اس کی ملاقات ایک ٹڈے سے ہو گئی۔ جھینگر اس وقت اچھے موڈ میں تھا اس نے مذاق ہی مذاق میں ٹڈے کو ایک دھپ جمادی۔ ٹڈا جو پہلے ہی اپنی پڑوسی مکڑی سے لڑ کر نکلا تھا اور غصے میں تھا، جھینگر پر پل پڑا اور اس کی خوب تواضع کی۔ جھینگر گھبرا گیا اس کو اندازہ نہ تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی۔ جب ٹڈے نے اس کی ٹانگ پر بھی کاٹ کھایا تو وہ حواس باختہ ہو کر چلانے لگا۔ تکلیف سے اس کا بُرا حال تھا۔ ٹڈے نے دل کھول کر بھڑاس نکالی۔ پھر جونہی وہ کچھ ڈھیلا پڑا۔ جھینگر نے فرار ہونے میں ہی عافیت جانی اور تیزی سے دوڑا۔ ٹڈا پیچھے آیا۔ جھینگر کو قریب ہی ایک بل نظر آیا وہ اس میں گھس گیا۔ بل کا منہ چھوٹا تھا ٹڈا اس میں نہیں گھس سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر تو باہر رکا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔

جھینگر بل میں ہی چھپ گیا۔ ٹڈے نے اس کی خوب پٹائی کی تھی، اُسے کئی زخم آئے تھے۔ کچھ دیر بعد جب اس کے اوسان

جنگل کے مشرقی حصے میں درختوں میں گھرا پانی کا ایک تالاب تھا۔ تمام جانور پانی پینے کے لیے وہاں آتے تھے۔ اسی تالاب کے کنارے جھاڑیوں میں ایک جھینگر کا بسیرا تھا۔ وہ ایک نٹ کھٹ اور شرارتی جھینگر تھا۔ دن کا زیادہ وقت وہ سو کر یا آرام کر کے گزارتا، لیکن شام ہوتے ہی باہر نکل آتا۔ تالاب کے کنارے چہل قدمی کرتا اور دھیرے دھیرے اپنا گیت گاتا، جوں جوں شام ڈھلتی جاتی اس کے گیتوں میں تیزی آتی جاتی۔ اس نے اپنے کھنڈری طبیعت اور ذہانت سے ان گیتوں میں بہت سی تبدیلیاں کی تھیں، سننے والوں کو وہ گیت بھلے لگتے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب جنگل کی زندگی میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ جانور بھی انسانوں کی طرح مختلف کام سرانجام دیتے تھے۔ مثلاً لنگور شام کو درختوں پر چھلانگیں لگانے اور جھولا جھولنے کا شو کرتے جسے دیکھنے کے لیے ٹکٹ لینا پڑتا تھا، چیتے نے سکول کھول لیا تھا، جہاں جانور کے بچے تعلیم کے ساتھ ساتھ اچھی تربیت بھی

بحال ہوئے تو اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ چیونٹیوں کا بل تھا۔ جھینگر اس کی وسعت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اندر لمبی لمبی راہداریاں، بڑے بڑے کمرے اور کشادہ راستے تھے۔ چیونٹیاں اپنے کاموں میں لگی تھیں۔ وہ آنے والی سردیوں کے لیے خوراک ذخیرہ کر رہی تھیں۔ جھینگر حیرت سے پلکیں جھپکا رہا تھا کہ چیونٹیوں کی اس پر نظر پڑ گئی۔ وہ فوراً بن بلائے مہمان کو دبوچنے کے لیے آگے بڑھیں۔ انہیں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر جھینگر کے ہوش اڑ گئے اسے اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ وہ گھبرا کر چیخنے لگا اسی دوران ملکہ چیونٹی بھی اپنے محل سے باہر نکل آئی۔ اسے دیکھتے ہی جھینگر رونی صورت بنائے التجائی آواز میں آداب بجالایا اور بولا:

”ملکہ عالیہ! خدا آپ کا سایہ تادیر ہم حشرات الارض پر قائم و دائم رکھے۔ یہ جھینگر ناچیز غلطی سے آپ کے بل میں گھس آیا ہے، یہ مصیبت زدہ ہے اس کی جان بخشی کی جائے۔“

جھینگر نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا تھا۔ ملکہ چیونٹی اس کی تقریر سن کر ہنس پڑی۔ اس نے دوسری چیونٹیوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ سب اس کے اشارے پر رک گئیں۔

”تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟“ ملکہ نے پوچھا۔ جھینگر نے اپنی دکھ بھری داستان نمک مرچ لگا کر سنائی۔ وہ اس بات کو گول کر گیا تھا کہ ٹڈے سے لڑائی اس نے خود شروع کی تھی۔ وہ بولا: ”یہ مظلوم مسافر آپ سے پناہ کا طلب گار ہے۔“

ملکہ چیونٹی نے اس کی درخواست قبول کر لی اور اسے چند دن بل میں گزارنے کی اجازت دے دی۔ ملکہ نے جھینگر کے علاج کے لیے ایک بوڑھی چیونٹی کو بلایا، جس نے اس کے زخموں پر مرہم لگایا اور اسے پینے کے لیے کڑوی کیسی دوا دی۔ یہ دیکھ کر دوسری چیونٹیاں منہ بنا کر رہ گئیں۔ ایک آسان شکار ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

دن بھر جھینگر مزے سے لیٹا بل کا جائزہ لیتا رہا۔ تمام چیونٹیاں اپنے کاموں میں مصروف رہیں۔ رات ہوئی تو جھینگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کچھ چیونٹیاں تو آرام کر رہی ہیں، لیکن کچھ مسلسل کام میں لگی تھیں۔ جھینگر نے اپنا گیت شروع کیا۔ وہ دکھ بھرے

انداز میں صدا لگا رہا تھا۔ چیونٹیاں کچھ دیر تو برداشت کرتی رہیں پھر اس پر چڑھ دوڑیں۔

وہ بولا: ”ظالمو! مجھے مت روکو۔ گیت گانا میری فطرت ہے۔“ ملکہ کی مداخلت سے یہ معاملہ ٹھنڈا ہوا۔

دوسرے دن پھر سب چیونٹیاں اپنے اپنے کاموں میں لگ گئیں، لیکن میاں جھینگر آرام کر رہے تھے اور ایک گودام سے چینی چٹ کرتے جا رہے تھے۔ چیونٹیاں اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس پر جملے کس رہی تھیں۔ ایک چیونٹی نے آواز لگائی: ”اے نکھو! اٹھو کچھ کام کرو، باہر دن چڑھ آیا ہے۔“

دوسری چیونٹی بولی: ”آج کام کا دن ہے، دنیا میں سب کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور تو یہاں بے کار پڑا ہے۔“ لیکن جھینگر پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ مسکراتے ہوئے چینی کھاتا رہا۔ غرض اس نے تین دن بل میں گزارے۔ اس کی ٹانگ کا زخم ٹھیک ہو گیا تو اس نے چلنے کی ٹھانی اور ملکہ سے جانے کی اجازت طلب کی۔

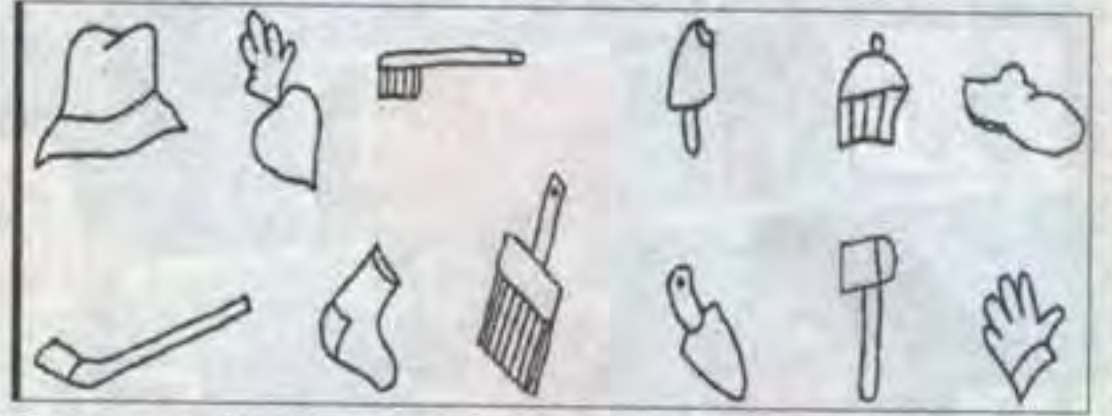
ملکہ بولی: ”ضرور جاؤ، لیکن یہ تو بتاؤ، تم کام کیا کرتے ہو؟“ جھینگر شرمندگی سے بولا: ”ابھی تک کوئی کام شروع نہیں کیا۔“ ”اچھا! کیا تم اس جنگل میں نہیں رہتے؟“ ملکہ نے پوچھا۔

”میں یہیں رہتا ہوں، لیکن کچھ کرتا نہیں..... لیک..... لیکن کچھ وقت یہاں گزار کر میری آنکھیں کھل گئی ہیں، میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ محنت میں عظمت ہے۔ مجھے اگرچہ کوئی کام نہیں آتا، لیکن میں گیت گانے میں ماہر ہوں۔ چیتے نے مجھے کئی بار پیشکش کی ہے کہ میں جانوروں کے بچوں کو کھیل ہی کھیل میں تعلیم دینے کے لیے اس کے سکول میں ملازمت کر لوں گا۔ وہ مجھے معقول معاوضہ دینے کو تیار ہے۔ سوچ رہا ہوں میرے لیے یہ کام ٹھیک رہے گا۔“

ملکہ بولی: ”میاں جھینگر! تمہارا ارادہ اچھا ہے، وہ جان دار خوش نصیب ہوتا ہے جس کا شوق اور روزگار ایک ہی ہو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

جھینگر نے تمام چیونٹیوں کو اللہ حافظ کہا اور بل سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆



یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجئے اور شاباش لیجئے۔





سخت سردیوں کی ایک رات تھی۔ لوگ سرد موسم کی وجہ سے جلد ہی اپنے گھروں کو چلے گئے تھے جس سے سڑکوں پر سناٹا چھا گیا تھا۔ بارش کے بعد ٹھنڈی ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ ایسے میں چچا تیز گام گھر میں اپنے بچوں، ملازموں اور دوستوں کے ساتھ ہیٹر کے سامنے بیٹھے مونگ پھلیاں کھا رہے تھے۔

”بھئی اس مرتبہ تو بہت سخت سردی پڑ رہی ہے۔“ جن مونگ پھلیاں چھیلے چھیلے بولے۔

”واقعی اس مرتبہ تو سردیاں جانے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔“ استاد بولا۔

ان دونوں کی گفت گو کے دوران اچانک کھڑکی سے تیز ہوا کا جھونکا آیا تو مونگ پھلیوں کے چھلکے پورے کمرے میں پھیل گئے۔ ان چھلکوں کو یوں اڑتا دیکھ کر چچا تیز گام نے تیزی سے چھلانگ لگائی اور چھلکوں کو سمیٹنے لگے۔ ان کی یہ حالت کو دیکھ کر عروج فاطمہ بولی:

”ابو جان، آپ رہنے دیں، جب ہم مونگ پھلیاں کھالیں گے تو پھر میں یہ چھلکے اٹھالوں گی۔“

”جیتی رہو بیٹی! تم بہت فرمانبردار بچی ہو، لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ اگر تمھاری امی جان نے کمرے میں چھلکوں کو دیکھ لیا تو آئندہ ہم اس آزادی سے دوستوں کے ساتھ خشک میوے نہ کھاسکیں گے۔“ چچا تیز گام بولے۔

چچا تیز گام کو کاغذ کی تھیلی میں چھلکے جمع کرتے دیکھ کر جن اور استاد کو بھی اپنی مالکن کی ڈانٹ کا خیال آ گیا، جس کے خوف سے وہ بھی چھلکے سمیٹنے لگے اور ساتھیوں کو ہدایت دینے لگے:

”تمام لوگوں سے درخواست ہے کہ اپنے چھلکے یا تو پلیٹوں میں یا اپنی جیبوں میں رکھیں، تاکہ ہماری مالکن صاحبہ کو کانوں کان خبر نہ ہو۔“

پہلوان جی کو خشک میوہ جات اتنے زیادہ پسند نہیں تھے وہ تو صرف قلفی یا برف کا گولا کھانا پسند کرتے تھے، وہ کہنے لگے:

”چچا یہ بتائیے کہ سردیوں میں کبھی خشک میوہ جات کیوں کھاتے ہیں، قلفی یا برف کا گولا کیوں نہیں کھاتے؟“

”لو بھئی یا بات بھی کوئی پوچھنے والی ہے؟ اتنی آسان سی بات ہے کہ جو لوگ گرمیوں میں قلفیاں اور برف کا گولا فروخت کرتے ہیں وہ سردیوں میں خشک میوہ جات فروخت کرنے لگ جاتے ہیں، جس کی وجہ سے قلفی یا برف کا گولا بازار میں ملتا نہیں ہے۔“ بھولا میاں نے کہا۔

چچا تیز گام مونگ پھلیاں کھانے میں مگن تھے اور ساتھ ہی ساتھ پہلوان اور بھولا میاں کی نوک جھونک بھی سن رہے تھے۔ انھیں خود بھی قلفی کھانا بہت پسند تھا، قلفی کا نام سن کر ان کے منہ میں پانی آ گیا، وہ ان دونوں کو مخاطب کر کے کہنے لگے:

”میاں سردیوں میں قلفیاں وہ لوگ کھاتے ہیں جو بہادر اور زندہ دل ہوں، گرمیوں میں سب ہی لوگ قلفی اور برف کا گولا کھاتے ہیں، کوئی ہے دلیر جو اس سرد موسم میں قلفی کھا کے دکھائے؟“

بھولا میاں چاہتے تھے کہ ان کے دوست سردی کے موسم میں ٹھنڈی چیزیں نہ کھائیں، تاکہ وہ بیمار نہ ہو جائیں، وہ کہنے لگے:

”چچا تیز گام آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ اس سخت سردی میں جو قلفی کھائے گا، اس کی خود ہی قلفی جم جائے گی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اگر ہم گرمیوں میں مونگ پھلیاں کھائیں گے تو سب مونگ پھلی بن جائیں گے؟“ جن بھی بولا۔ جن کی یہ بات سن سب لوگ ہنسنے لگے۔

”تم سب لوگ بزدل اور کمزور ہو، میری طرح بہادر بنو، بہادر، میں ابھی باہر جا کر تم لوگوں کو قلفی کھا کر دکھاتا ہوں۔ ہم سردی میں قلفی کھانے پر قلفی نہیں بنیں گے، اگر ہم قلفی بن گئے تو اس خوشی میں سب دوستوں کو قلفیاں کھلائیں گے۔“ چچا تیز گام نے یہ کہہ کر مونگ پھلیاں ایک طرف رکھ دیں۔

چچا تیز گام باہر جا کر قلفی کھانے کے لیے ضد کر رہے تھے، لیکن کوئی بھی ان کے ساتھ باہر جانے کے تیار نہیں تھا، بڑی مشکل سے پہلوان اور استاد ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوئے۔ پھر تینوں سویٹر، جیکٹ، شال، گرم موزے، گرم ٹوپی، مفکر، گرم دستانے اور نہ جانے کیا کیا پہن کر باہر نکلے۔ چچا سوچ رہے تھے کہ باہر زیادہ سردی نہیں ہوگی، لیکن جب وہ گلی میں آئے تو سرد ہوانے ان کا استقبال کیا۔ انھیں احساس ہو رہا تھا کہ گھر سے باہر آ کر انہوں نے غلطی کی ہے۔ گھر کے اندر ہیٹر کے سامنے بیٹھنے سے کتنا سکون مل رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ دوبارہ گھر واپس چلے جائیں، چوں کہ وہ اپنے دوستوں کے سامنے قلفی کھانے کا دعویٰ کر آئے تھے، اس لیے واپس جاتے ہوئے انھیں شرم محسوس ہو رہی تھی۔ مرتے کیا نہ کرتے آخر وہ کانپتے ہوئے چلنے لگے۔

”چا..... چا..... تیز، تیز گام اُف..... اتح.....، کیا خیال ہے، گھر واپس نہ چلیں؟“ سردی کے مارے پہلوان جی کے منہ سے الفاظ بھی پوری طرح ادا نہیں ہو رہے تھے۔

”ک..... کیا، کیا کہہ رہے ہو؟..... گھر نہیں نہیں.....“

ہم قلفی کھائے بغیر نہیں جائیں گے، چاہے ہماری قلفی جم جائے۔“ چچا تیز گام کے کان بھی سردی کی وجہ سے اونچا سننے لگے تھے۔

”مگر یہاں تو چاروں طرف سناٹا ہے، کوئی بھی قلفی والا نظر نہیں آرہا، بلکہ مارکیٹ کا چوکی دار بھی نظر نہیں آرہا، لگتا ہے وہ بھی سو گیا ہے۔“ استاد بھی دبے الفاظ میں واپس جانے کا کہہ رہا تھا۔

”یہ سبزی مارکیٹ ہے، صبح صبح کھلتی ہے۔ اس لیے یہاں اس وقت سناٹا ہے، ہم آگے چلتے ہیں، اُمید ہے کہ آگے جا کر ہمیں وہاں لوگ بھی نظر آجائیں گے اور قلفیاں بھی۔“

چچا تیز گام اپنے آپ کو بہادر ثابت کرنے کے لیے دونوں کا حوصلہ بڑھانے لگے اور جیبوں سے ہاتھ باہر نکال کر تیز تیز چلنے لگے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے رہے سناٹا بڑھتا رہا، ایک دم گھنٹہ گھر سے گھنٹے کے بجنے کی آواز سنائی دی۔ آواز سن کو تینوں ڈر گئے۔ انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو رات کے ۲ بج رہے تھے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ شہر میں چوری کی بڑھتی ہوئی وارداتوں کی وجہ سے شہر میں پولیس کا سخت ناکہ لگا ہوا تھا۔

جب یہ تینوں کافی دُور چلے گئے تو انھیں پولیس کی ایک چوکی نظر آئی، جہاں پر پولیس والے کھڑے ہوئے تھے۔ پولیس والوں نے دیکھا کہ تینوں ادھر ادھر دکانوں میں کچھ تلاش کر رہے ہیں۔ ان کے عجیب و غریب حلیے دیکھ کر ایک پولیس والے نے انھیں آواز دی۔ یہ پہلے ہی گھبرائے ہوئے تھے، پولیس کی آواز سنائے میں گونجنے سے تینوں مزید ڈر گئے۔

”چچا یہ پولیس والا ہمیں اتنی اُونچی آواز میں کیوں پکار رہا ہے؟“ استاد خوف زدہ ہو گیا تھا۔

”ڈرتے کیوں ہو، مجھے لگتا ہے کہ وہ ہمیں قلفیاں کھلانے کے لیے بلارہے ہیں۔“ چچا بولے۔

”میرا خیال ہے کہ وہ ہمیں قلفیاں نہیں، حوالات کی چٹنی روٹی کھلانے کے لیے بلارہے ہیں۔“ پہلوان جی نے کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا..... کیا پولیس والے قلفیوں کو چٹنی روٹی کہتے ہیں؟“ چچا پوچھنے لگے۔

”مجھے ابھی یاد آیا کہ آج ہی اخبار میں خبر شائع ہوئی تھی کہ شہر میں پولیس سخت چیکنگ کر رہی ہے، اگر کہیں زیادہ افراد اکٹھے نظر

آئیں گے تو انھیں تھانے میں بند کر دیا جائے گا۔“ پہلوان جلدی جلدی بولا۔

”یعنی کہ..... یعنی ہمیں فوراً یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے ورنہ پھر حوالات.....“ یہ کہہ کر چچا نے پہلے آہستہ اور پھر تیز بھاگنا شروع کر دیا، ان کو بھاگتا دیکھ کر پہلوان اور استاد بھی سرپٹ دوڑے۔ پولیس پہلے ہی ان تینوں کو حلیوں سے مشکوک سمجھ رہی تھی اس طرح بھاگتے دیکھ کر تو پولیس بھی حرکت میں آگئی۔ چچا تیز گام حسب معمول بھاگنے میں سب سے آگے تھے، ان کے پیچھے استاد اور پھر پہلوان بُری طرح ہانپتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ پولیس کے سپاہی نے انھیں آواز دی۔

”رک جاؤ، ارے رُک جاؤ، ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔“

وہ لوگ کہاں رُکنے والے تھے۔ پولیس کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر وہ مزید اور تیزی سے بھاگنے لگے۔ پولیس نے جلد ہی تینوں کو پکڑ لیا اور زبردستی انہیں گاڑی میں بٹھایا اور تھانے میں لے گئے۔ تھانے میں پولیس والوں نے ان سے سوالات کرنا شروع کیے۔

”آپ کا کیا نام ہے؟“

”میرا نام ہے چچا تیز گام۔“

”لیکن آپ کے شناختی کارڈ پر تو تنویر احمد لکھا ہوا ہے۔“

”وہ جی میرا اصل نام تنویر احمد ہے، لوگ مجھے میری تیزی کی وجہ سے چچا تیز گام کہتے ہیں۔“

”آپ کی تیزی تو ہم نے دیکھی تھی جناب، سب سے پہلے آپ ہی پولیس کو دیکھ کر بھاگے تھے۔“

پولیس والے ان تینوں کو چور سمجھ رہے تھے اس لیے ان سے چوروں کی طرح سلوک کر رہے تھے۔

”اچھا تو چچا تنویر،..... تیز گام احمد۔ اُف کیا مصیبت ہے، تمھارا نام کتنا عجیب ہے، کیا نام بتایا تھا تم نے چچا بے لگام؟“ پولیس والے کو چچا کا نام یاد نہیں ہو رہا تھا۔

”ان کا نام آپ ادب سے لیں، یہ ہمارے مالک ہیں۔“ استاد درمیان میں بولا۔

”تم کون ہوتے ہو مجھے ادب سکھانے والے؟“

”میں استاد ہوں.....“

”تم کہاں کے استاد ہو، مجھے تو تم استاد کم اور شاگرد زیادہ لگتے ہو، لیکن میں ایک بات تمھیں بتا دوں، تمھاری استاد یہاں نہیں چلے گی۔“

”اور تم کون ہو؟“ سپاہی نے پہلوان سے پوچھا۔

”میں پہلوان ہوں..... پہلوان۔“

”اچھا تو تم پہلوان ہو، جب تم ایک دو دن حوالات میں رہو گے تو تمھاری سب پہلوانی نکل جائے گی۔“

”تم لوگوں کو شرم نہیں آتی، نفلی نام رکھ کر چوریاں کرتے ہو۔ سچ بتاؤ، تمھارے اصلی نام کیا ہیں اور تم لوگ کہاں واردات کرنے جا رہے تھے؟“ پولیس والے نے سختی سے باز پرس کی۔

”ک..... کک..... کون سی واردات، کیسی واردات، ہم تو قلفی کھانے جا رہے تھے۔“ پہلوان کی رونے جیسی حالت ہو گئی۔

”تم ہمیں بیوقوف سمجھتے ہو۔ اس موسم میں قلفی کون کھاتا ہے؟“ پولیس والے کو غصہ آگیا۔ اس نے انھیں حوالات میں بند کر دیا۔ حوالات میں بند ہوتے ہی پہلوان اور استاد ایک دوسرے پر اپنا غصہ نکالنے لگے۔

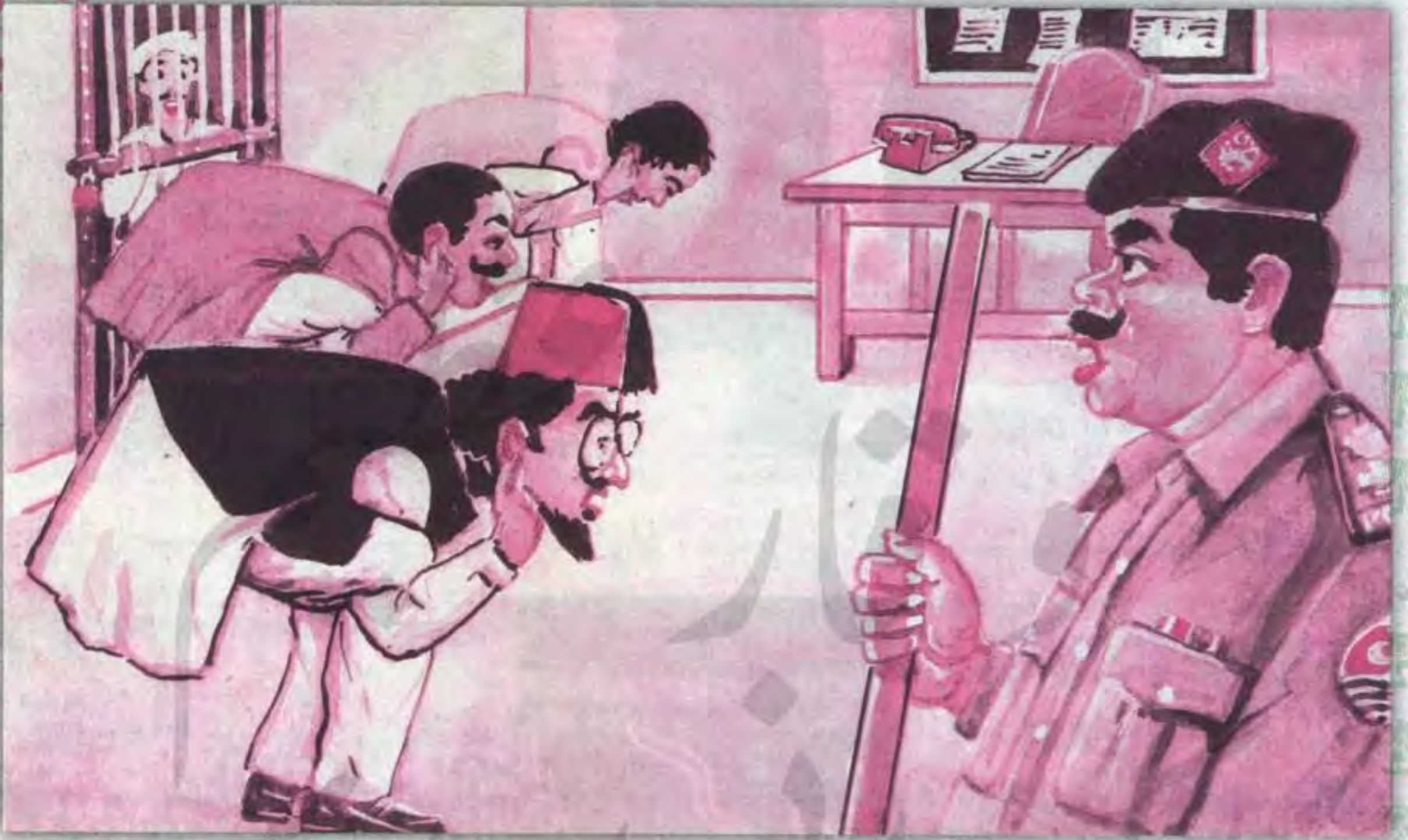
”استاد یہ سب تمھاری وجہ سے ہو رہا ہے، تم نے بھاگنے کا مشورہ دیا تھا۔“ پہلوان بولا۔

”میری نہیں، یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا ہے۔ تمھیں معلوم تھا کہ رات کے وقت باہر گھومنے پر پابندی لگی ہے تو پہلے بتا دیتے۔“ استاد نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”اے میرے اللہ! یہ دن بھی زندگی میں دیکھنا تھا۔ یہ سب تم دونوں کی وجہ سے ہوا ہے، ہم لوگ کیوں قلفی کھانے کے لیے اس سردی کے موسم میں باہر نکلے۔“ چچا تیز گام بھی حواس باختہ ہو گئے۔

”چچا تیز گام..... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، ہمیں تو آپ نے ہی قلفی کھانے کے لیے تیار کیا تھا۔ اگر ہم آپ کی باتوں میں نہ آتے تو اس وقت حوالات کی بدبودار ہوا کھانے کے بجائے گھر میں ہیٹر کی گرم ہوا کھا رہے ہوتے۔“ پہلوان کہنے لگا۔

تینوں کی گفت گو سن کر ایک سپاہی موٹا سا ڈنڈا لے کر ان کے پاس آیا اور کہنے لگے: ”اتنا شور کیوں کر رہے ہو، یہ حوالات ہے، کوئی چائے کا ہوٹل نہیں ہے، چلو سب مرغا بن جاؤ۔“



پولیس والے کی بارعب آواز اور ہاتھ میں موٹا ڈنڈا دیکھ کر چچا تیز گام، استاد اور پہلوان فوراً کسی سکول کے بچوں کی طرح مرغا بن گئے۔
”استاد! آج تم فجر کی اذان کتنے بجے دو گے؟“ پہلوان استاد کو چھیڑنے لگا۔

”ایک مرتبہ یہاں سے باہر نکل جاؤں، پھر میں تمہیں اذان کا وقت بتاؤں گا۔“ استاد کو مرغا بنے پسینہ آ گیا تھا۔
انہیں مرغا بنے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ایک پولیس افسر وہاں آیا۔ اس نے تینوں کو حوالات میں مرغا بنے دیکھا تو ایک سپاہی سے کہہ کر انہیں اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ افسر نے جب تینوں کو اپنے کمرے میں بٹھا کر پوچھ گچھ کی تو اُسے حقیقت کا پتہ چل گیا۔ پولیس افسر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا:
”ہمیں بے وقت کی راگنی نہیں راگنی چاہیے۔“
”سر! آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن ہم بے وقت راگنی نہیں بل کہ بے وقت کی قلفی کھانے جا رہے تھے۔“ پہلوان بولا۔

”موسم کے لحاظ سے اپنے کھانے، پینے اور لباس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ سخت سردی کے موسم میں قلفی کھانا عقل مندی نہیں ہے، اس سے ہم بیمار بھی ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں صحت دی ہے، یہ ہمارے پاس اس کی امانت ہے، ہمیں اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے، میں تم تینوں کو اس شرط پر رہا کر رہا ہوں کہ تم

لوگ آئندہ اتنی رات کو اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلو گے۔“ پولیس افسر کی بات سننے کے بعد تینوں نے ایسا نہ کرنے کا وعدہ کیا۔
”کیا آپ ہمیں قلفی نہیں کھلائیں گے؟“ چچا تیز گام کو ابھی تک قلفی یاد آرہی تھی۔

”اس وقت تو میں آپ لوگوں کو قلفی نہیں کھلا سکتا، البتہ آپ لوگوں کو گھر تک پہنچانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔“ پولیس افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پولیس افسر ایک نیک آدمی تھا، اس نے اپنی گاڑی میں ان کو گھر پہنچا دیا۔

جب چچا تیز گام، استاد اور پہلوان گھر آئے تو جنم، بھولا میاں اور عروج فاطمہ بہت خوش ہوئے۔ یہ لوگ کافی دیر سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ جنم نے استاد سے پوچھا:
”کیا قلفی مل گئی تھی؟“ جنم نے سوال کیا۔

”قلفی تو نہ ملی البتہ.....“ استاد پوری داستان سنانا چاہتا تھا، لیکن چچا تیز گام نے ہاتھ کے اشارے سے جنم کو خاموش کرادیا۔
”قلفی کھا کر کیا کرنا ہے۔ یہ تو سردی کا موسم ہے، اس موسم میں قلفی نہیں کھانی چاہیے، لاؤ میری مونگ پھلیاں، ہم مونگ پھلیاں ہی کھائیں گے۔“ پھر چچا تیز گام، استاد اور پہلوان بیٹر کے سامنے بیٹھ کر مزے دار مونگ پھلیاں کھانے لگے۔

پیارے اللہ کے پیارے نام

اسی وقت حضرت جبریل امین علیہ السلام تشریف لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ”جب اس کے والد آجائیں تو آپ پوچھیں کہ وہ کیا باتیں ہیں جو اس نے اپنے دل میں کہیں۔ وہ باتیں جو اس کے کانوں نے بھی نہیں سنیں۔“

جب وہ شخص اپنے والد کو لے کر پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے والد سے دریافت فرمایا:

”کیا بات ہے؟ آپ کا بیٹا آپ کی شکایت کرتا ہے۔ کیا آپ اس کا مال چھیننا چاہتے ہیں؟“

والد نے عرض کیا: ”آپ اسی سے یہ سوال فرمائیں کہ میں اس کا مال اس کی پھوپھی، خالہ یا صرف اپنے اوپر خرچ کرنے کے علاوہ کہاں خرچ کرتا ہوں؟“

یہ جواب سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بس حقیقت معلوم ہوگئی اب اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔“ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کے والد سے پوچھا:

”وہ کیا باتیں ہیں جنہیں تم نے اپنے دل میں کہا، اور جن کو ابھی تک تمہارے کانوں نے بھی نہیں سنا، وہ مجھے بھی سناؤ۔“ اس شخص نے عرض کیا:

اَلْعَلِيمُ جَلَّ جَلَالُهُ

(سب کچھ جاننے والا)

”اَلْعَلِيمُ جَلَّ جَلَالُهُ“ سے زمین و آسمان میں کوئی چیز بھی چھپی ہوئی نہیں ہے اور مخلوق میں سے کوئی اگر کچھ اپنے سینے میں چھپانا چاہے تو چھپا نہیں سکتا۔ اُسے ہر چیز کا علم ہے۔ یہ اسم مبارک قرآن کریم میں 157 مرتبہ آیا ہے۔

ساری دُنیا کے سمندروں میں کتنے قطرے ہیں؟ ساری دُنیا کی ریت کے کتنے ذرات ہیں؟ اب تک بارش کے کتنی بوندیں برس چکی ہیں اور آئندہ کتنی بوندیں برسیں گی، ان سب کا اُسے علم ہے۔ اسے درخت سے گرنے والے ہر پتے کا بھی علم ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ درخت کا یہ پتا درخت پر کتنی مرتبہ الٹ پلٹ ہوگا، کب اور کہاں گرے گا؟ یہ سب علم اس کے پاس ہے۔

دل کی بات

ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی: ”میرے والد نے میرا مال لے لیا ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اپنے والد کو بلا کر لاؤ۔“

”اے اللہ کے رسول آپ ﷺ پر ہمارا یقین اور بڑھ جاتا ہے کہ وہ بات جو میرے کانوں نے نہیں سنی، اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو اس کی اطلاع فرما دیتے ہیں۔“

پھر اس شخص نے کہا: ”یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے چند اشعار اپنے دل میں کہے تھے جن کو میرے کانوں نے بھی نہیں سنا وہ میں نے غم کی حالت میں دل ہی دل میں کہے تھے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ ہمیں بھی سناؤ۔ پھر اس نے دل میں آنے والے وہ دردناک اشعار سنائے۔ جن کا مفہوم یہ ہے۔

۱۔ اے بیٹے! میں نے بچپن میں تیری غذا کا انتظام کیا اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی، تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا۔

۲۔ اے بیٹے! بچپن میں اگر تمہیں کوئی بیماری پیش آگئی تو میں نے تمام رات تمہاری بیماری کی وجہ سے جاگنے اور بے قراری میں گزار دی۔ ایسا لگتا جیسے تمہاری بیماری مجھے ہی لگی ہے، تمہیں نہیں جس کی وجہ سے میں تمام رات روتا رہا۔

۳۔ میرا دل تمہاری موت سے ڈرتا رہا حالاں کہ میں جانتا تھا کہ مرنے کا ایک دن مقرر ہے جو آگے یا پیچھے نہیں ہو سکتا۔

۴۔ پھر جب تم اس عمر اور اس حد تک پہنچ گئے جس کی تمنا تو کیا کرتا تھا۔ تو تم نے میری (شفقت کا) بدلہ سختی اور سخت بات سے دیا جیسے تم ہی نے مجھ پر احسان کیا ہو۔

۵۔ کاش! اگر تم سے میرے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہو سکتا تو کم از کم ایسا ہی کر لیتے، جیسا ایک شریف پڑوسی دوسرے

پڑوسی سے کیا کرتا ہے۔ کم از کم مجھے پڑوسی جیسا حق دیتے اور خود میرے ہی مال میں میرے واسطے کنجوسی نہ کرتے۔

یہ اشعار سننے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہو گئے اور پھر غصے سے اس کے بیٹے کا گریبان پکڑ لیا اور فرمایا: ”جاؤ بھی اور تیرا مال بھی سب تیرے باپ کا ہے۔“

اس نام مبارک کے پڑھنے سے ہمیں یہ سبق ملا کہ ہمیں یقین ہو کہ کائنات کی ہر شے کا علم صرف ایک اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ سب کو علم اسی نے عطا فرمایا ہے۔ کسی بھی انسان کا علم ”الْعَلِيمُ جَلَّ جَلَالُهُ“ جیسا نہیں۔ انسان کو تو بس اتنا علم ہے جو اس نے انسانوں کو دیا ہے۔ آپ نے اس ایمان افروز واقعے میں پڑھا کہ ان صحابی کے دل کی بات تک کو اللہ تعالیٰ جانتے تھے۔ اور اس کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔

اس ”الْعَلِيمُ جَلَّ جَلَالُهُ“ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمیں یہ بات بتائی کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ لہذا ہمیں خوب دل لگا کر علم حاصل کرنا چاہیے۔ جماعت میں اپنے اپنے ہم جماعتوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اپنے علم میں اضافے کے لیے ”الْعَلِيمُ جَلَّ جَلَالُهُ“ سے مدد لینی چاہیے۔ علم کی دولت ملے تو اپنے علم پر اترا نا نہیں چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ علم مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے جب چاہے وہ چھین لے اور جب چاہے وہ علم عطا فرما دے۔

علم میں اضافے کے لیے یہ دُعا ”اللَّهُمَّ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا“ (اے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما) مانگتے رہنا چاہیے۔

سلسلہ ”کھوج لگائیے“ میں ان بچوں کے جوابات کے بھی درست تھے

زار احمد، راول پنڈی۔ رخشی آفتاب، کراچی۔ محمد حمزہ مقصود، لاہور۔ رمشا خالد، راول پنڈی۔ نور سحر، واہ کینٹ۔ عالیہ اقبال، پشاور۔ شین ہادیہ، اسلام آباد۔ اسفر علی، بہاول پور۔ انس ابراہیم، حذیفہ نعیم، گوجرانوالہ۔ معاذ اکبر، عدینہ مقدس، فیصل آباد۔ محمد ذیشان علی، سرانے عالم گیر۔ معیز طارق، راول پنڈی۔ علی شہروز، فیصل آباد۔ ارمغان علی، گوجرانوالہ۔ اقراء رفیق، شیخوپورہ۔ سید ارضی بخاری، گوجرانوالہ۔ میمونہ شبیر، گوجرانوالہ۔ ہادی رضا بلوچ، راول پنڈی۔ رجب علی مغل، ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد ارمغان، واہ کینٹ۔ عبداللہ اطہر، راول پنڈی۔ شاہان حیدر، لاہور۔ عائشہ انعم، لاہور۔ محمد عمر معاذ، بہاول پور۔ ولید احمد سلیم، لاہور۔ ارسلان احمد، اٹک۔ مبین منیر کھوکھر، لاہور۔ منیب الرحمن، راول پنڈی۔ محمد بلال رسول، لاہور۔ ثمر خان، بھکر۔ مآب زینب، جہلم۔ شاہ زیب علی جٹ، سرگودھا۔ سیف علی، فیصل آباد۔ محمد عثمان علی شیخ، لاہور۔ اریب احمد، واہ کینٹ۔ ثناء اصغر، علیہ تحریم، احسن بشیر، لاہور۔ دانش علی خان، میاں والی۔ عزیز احمد، نوشہرہ۔ نمرہ اقبال، کراچی۔ آمنہ حیات، لاہور۔ سیف اللہ آرائیں، قصور۔ کاشف حیات، لاہور۔ سانیہ قادری، ملتان۔ جنید نعیم دیوان، حویلی لکھا۔

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

کھوج لگائیے!

دادی جان نے جب دیکھا کہ سب بچے آگئے ہیں تو انہوں نے کہا: ”آج میں آپ کو کہانی نہیں سناؤں گی۔“
”وہ کیوں؟“ دانیال نے پوچھا۔

”وہ اس لیے کہ آج آپ نے کچھ پہیلیوں کے جواب بتانے ہیں۔“
”اچھا، پہیلی بوجھ پہیلی، میں پہیلی بوجھوں گی۔“ رمشا بولی۔

”یہ تو بہت اچھا ہے، لو میں پہلی پہیلی پوچھ رہی ہوں۔“ دادی جان نے جب بچوں سے پہیلی پوچھی تو انہوں نے اس کا جھٹ جواب بتا دیا۔
دادی جان نے بچوں کو شاباش دی اور دوسری پہیلی پوچھی۔ بچوں نے کچھ سوچ کر اس کا بھی درست جواب دیا۔ دادی جان نے بچوں پر نگاہ ڈال کر ایک اور پہیلی پوچھی۔

گرمی میں وہ آفت ڈھائے
سردی ہو تو سب کو بھائے
سارا سال رہے وہ سر پر
کوئی تو اُس کا نام بتائے

بچوں نے اس پہیلی کا بھی فوراً جواب دے دیا۔ آپ نے کھوج لگانا ہے کہ بچوں نے اس پہیلی کا کیا جواب دیا تھا۔



دسمبر 2012ء میں شائع ہونے والے ”کھوج لگائیے“ کا صحیح حل: ٹریفک سارجنٹ نے ایاز کا اس لیے چالان کیا تھا کہ وہ گاڑی چلاتے ہوئے موبائل فون کا استعمال کر رہا تھا۔

درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں۔

- 1- مسکان وسیم خان، کراچی
- 2- محمد فہیم انجم، چونیاں
- 3- رسال احمد، لاہور
- 4- حر عباس، سرگودھا
- 5- عبدالرحمن، ساہی وال

بھی زیادہ سہم گئی ہیں۔“ احمد بولا۔
”زیادہ باتیں نہ کرو ورنہ۔“

”ورنہ..... ورنہ..... کک..... کیا ہو گا آپ جی جان۔“ احمد نے
مشکل سے بات پوری کی۔

”ورنہ وہ اندر آ جائے گا..... اور..... اور پھر نہ جانے کیا ہو
گا۔“ مہک نے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

ابھی دونوں بہن بھائی باتیں کرنے میں مصروف تھے کہ
دروازہ جھٹ سے کھلا اور ایک نقاب پوش لڑکا ڈاکو اندر داخل ہوا۔
اُس کے ہاتھ میں پستول تھی اور وہ برابر ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔
”خبردار.....“ کمرے میں آواز گونجی..... ”کوئی اپنی جگہ
سے نہیں ہلے گا..... ورنہ جان سے مار ڈالوں گا۔“

دونوں سن کر بولے:-

”ہمارا قصور کیا ہے؟“

”وہ بھی بتا دوں گا۔“

”آپ کھانا کھائیں گے؟“ احمد نے کھانے کی پیشکش کی۔

”نہیں..... مجھے کھانا نہیں..... بلکہ آپ کی موت چاہیے۔“

اُس نے لفظ موت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ موت کا لفظ سنتے ہی
دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ گئیں۔

”کیا ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں؟“ مہک گویا ہوئی۔

”ایک صورت ہے آپ کے پاس۔“ نقاب پوش بولا۔

”تو بتائیے، آپ کے یہاں سے چلنے جانے اور ہمارے بچنے
کی کیا صورت ہے؟“ احمد نے سوال داغا۔

”آپ دونوں کو مل کر سارا کھانا ختم کرنا ہو گا..... ایک لقمہ
بھی پلیٹ میں نظر نہ آئے۔“

”کیا.....!! بس اتنے سے کام کے لیے آپ یہاں آئے
ہیں؟ بھلا یہ بھی کوئی کام ہے۔ یہ کھانا ختم کرنا تو ہمارے بائیں
ہاتھ کا کھیل ہے۔“

”تو کرو..... میں پچاس تک گنتی گنوں گا۔“ نقاب پوش
پلیٹوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔



ڈاکو

(محمد محسن، لاہور)

اچانک زور دار دھماکہ ہوا۔ دھماکے کی آواز دروازے کی
بیرونی جانب سے آئی تھی۔ کمرے میں موجود احمد اور مہک رات کا
کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ آواز سن کر وہ سہم کر ایک دوسرے



کے قریب آ گئے۔

”ڈرو نہیں احمد جلدی سے کھانا کھا لو۔“ مہک نے احمد کو تھپکی
دیتے ہوئے کہا۔

”مم..... مگر ہمیں کچھ ہو گا تو نہیں.....؟“ احمد نے بہ مشکل کہا۔

”ارے اُس کی اتنی جرأت کہاں کہ وہ میرے چھوٹو کو کچھ
کہے۔“ مہک ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔

”جی نہیں، آپ اتنی بہادر بھی نہیں، کیوں کہ آپ تو مجھ سے

”کامران! اب تم بڑے ہو گئے ہو اور اچھائی اور برائی کو سمجھنے لگے ہو، مگر سمجھانے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔“ پھر انہوں نے مہک اور احمد کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور ان کو سمجھانے لگے۔

”دیکھو بچو! اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں پیدا کی ہیں ہمیں ان کی ناقدری نہیں کرنی چاہیے۔ اور اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“

ابا جان کی بات سن کر احمد اور مہک نے عہد کیا کہ وہ آئندہ کھانا ضائع نہیں کیا کریں گے۔ کامران بھی ایک طرف کھڑا رشک بھری نظروں سے احمد اور مہک کو دیکھ رہا تھا۔

(پہلا انعام: 150 روپے کی کتب)

پپی نیوایر

(سید عبدالاحد، فیصل آباد)

احسان اللہ نے جب اپنے بچوں کو بتایا کہ وہ اپنے نئے ہوٹل کا افتتاح ”پپی نیوایر“ کی شان دار اور رنگا رنگ پارٹی سے کریں گے تو ان کے بچوں میں سے انس اور طلحہ تو بہت خوش ہوئے تھے مگر ان کی بیٹی عالیہ کو یہ جان کر ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی تھی۔

”پاپا! کیا ہم پپی نیوایر کی پارٹی میں اپنے دوستوں کو بلا سکتے ہیں؟“ انس نے پوچھا۔

”بالکل بلا سکتے ہیں۔“

”میں تو حمزہ اور بلال کو بلاؤں گا، پارٹی میں بہت مزہ آئے گا۔“ انس خوش ہو کر بولا۔

عالیہ جب اپنے کمرے میں آئی تو کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ ان کے ہاں ہر سال نئے عیسوی سال کے آغاز پر رنگا رنگ پارٹی کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ماضی میں عالیہ بھی ان پارٹیوں کا حصہ ہوتی تھی، مگر جب سے ان کی جماعت میں مس راحیلہ آئی تھیں، ان کی سکھائی ہوئی باتوں سے عالیہ کی سوچ بدل گئی تھی۔ عالیہ کو معلوم ہوا تھا کہ نئے سال کے آغاز پر پرانے سال میں گزرے وقت پر نگاہ ڈالنی چاہیے اور اس بات کا احتساب کرنا چاہیے کہ ہم

نقاب پوش ابھی بیس تک ہی گنتی گن سکا تھا کہ امی جان کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ایک جھٹکے کے ساتھ ڈاکو کے منہ سے نقاب اتار دیا۔ احمد اور مہک کی مارے حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیوں کہ وہ اجنبی کوئی اور نہیں ان کے کامران بھائی تھے۔

”یہ کیا ڈراما ہو رہا تھا۔ تم تو مجھے کام بھی نہیں کرنے دیتے۔“ امی جان بولیں۔

”امی جان! ہم کھانا ہم کھا تو رہے تھے کہ بھائی جان اچانک اندر آ گئے اور ہمیں دھمکیاں دینے لگے۔“ احمد نے صفائی پیش کی۔

”کیوں بھئی..... کیا کہتے ہو مسٹر ڈاکو۔“ امی جان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ یہ دونوں کھانا بہت ضائع کرتے ہیں۔ میں روزانہ یہ بات نوٹ کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید ڈاکو کا یہ روپ ہی کھانا ختم کرنے میں مددگار ثابت ہو جائے۔“ کامران بولا۔

ہٹ جاؤ یہاں سے..... بھائی ہو یا جلا..... اگر انہیں کچھ ہو جاتا تو۔“ امی جان نے کامران کو گھورا۔

”امی جان! انہیں کچھ نہیں ہو گا..... آخر بہن بھائی کس کے ہیں؟“ کامران نے ہاتھ نچائے۔

”چل چپ کر..... باتونی کہیں کا..... آ لینے دو تمہارے ابو جان کو۔“ امی جی نے دھمکی دی۔ کچھ دیر بعد ابا جان گھر آ گئے۔

”بیگم صاحبہ! آج خیریت تو ہے بچوں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟“

”بات یہ ہے کہ میں کھانا لگا کر برآمدے میں چلی گئی تھی۔ جیسے ہی مجھے عجیب سی آوازیں آئیں میں دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی تو.....!“ اس سے پہلے کہ امی جان مزید کچھ کہتیں، احمد نے ساری کہانی سنا ڈالی۔

ساری بات سن کر ابو جی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر وہ کامران کو مخاطب کر کے بولے:

نے اُس سال میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگنی چاہیے اور آنے والے سال میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عافیت طلب کرنی چاہیے۔ ان باتوں کے بارے میں سوچ کر عالیہ کانپ کر رہ گئی کیوں کہ ان کے گھر میں تو ہر سال اس کے برعکس ہوتا آیا تھا۔



”میں اس سال ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“ یہ بڑبڑا کر وہ اپنے کمرے سے نکل کر ابو جان کے کمرے کی طرف بڑھی۔ ان کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اُس نے دروازے پر دستک دی۔ جب ابو جان نے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت دی تو وہ کمرے میں گئی۔

”ہماری بیٹی نے پپی نیوائر پارٹی کی تیاری مکمل کر لی ہو گی۔“ ابو جان نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔

”نہیں ابو جان میں نے پپی نیوائر پارٹی کے لیے کوئی تیاری نہیں کی اور نہ میں ایسا کروں گی۔“ عالیہ بولی۔

”کیوں؟“

”وہ اس لیے کہ میں اُس دن اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوں گی اور آنے والے سال کے لیے اللہ تعالیٰ کا رحمت و فضل طلب کروں گی، کسی بھی کام کا آغاز کرنے سے پہلے ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔“

اس کے ابو جان حیرت سے اپنی بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی عالیہ ہے جو سب سے پہلے اس طرح

کی پارٹیوں میں پیش پیش ہوتی تھی۔ جب عالیہ نے مس راحیلہ کی باتوں کو دہرایا تو ابو جان کچھ دیر کے لیے خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے رہے۔ کمرے میں چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر ابو جان نے سکوت توڑتے ہوئے کہا:

”میں ویسا ہی کروں گا جیسا میری بیٹی چاہتی ہے۔“

”ابو جان! کیا ویسا ہی ہوگا جیسا میں چاہتی ہوں؟“ عالیہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”جی، بالکل ویسا ہی ہوگا جیسا میری پیاری بیٹی چاہتی ہے۔“ ابو جان کی بات سن کر عالیہ خوش ہو گئی تھی۔

نئے سال کے آغاز پر ان کے ہاں قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا تھا اور غریبوں، مسکینوں کو کھانا کھلایا گیا تھا۔ مس راحیلہ بھی اس موقع پر موجود تھیں۔ اس موقع پر وہاں موجود تمام لوگ مس راحیلہ کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان کی تعریف کر رہے تھے۔

(دوسرا انعام انعام: 100 روپے کی کتب)

ترکیب

(محمد عزیز چشتی، ذریہ غازی خان)

گزرتے وقتوں کی بات ہے، ملک یونان میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ بادشاہ کو کھانے پینے کا بہت شوق تھا۔ مشیروں نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ایک ہی بات کہتا کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اس لیے خوب کھایا پیا جائے۔ کچھ عرصے بعد بادشاہ موٹا ہونا شروع ہو گیا، اس وجہ سے وہ اپنے روزمرہ کے کام ٹھیک طرح سے انجام نہیں دے پاتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا، لیکن اُس نے کھانے پینے کی عادت نہ چھوڑی۔ بہت سے حکیموں کو طلب کیا گیا جو اس کے موٹاپے کا علاج کرتے رہے، لیکن بے سود۔ ایک حکیم نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بات کہہ دی کہ تمام تر تکالیف اور مشکلات کی بنیادی وجہ ان کی بسیار خوری ہے اور جب تک بادشاہ اس پر قابو نہیں پاتے ان کے موٹاپے کا علاج نہیں ہو

سکتا۔ بادشاہ طبیب کا یہ مشورہ سن کر سب پا ہو گیا اور حکم دیا کہ اسے قید خانے میں ڈال دیا جائے۔

ایک دن بادشاہ کو بتایا گیا کہ سرحدی علاقے میں ایک دانا حکیم رہتا ہے، وہ لوگوں سے کم ملتا ہے، لیکن انسان کا چہرہ دیکھ کر مرض جان لیتا ہے اور ایسا علاج کرتا ہے کہ پہلی خوراک سے ہی افاقہ ہو جاتا ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا فوراً اس عقل مند حکیم کو دربار میں پیش کیا جائے۔ حکیم جب دربار میں پیش ہوا تو اس کو تعجب ہوا کہ شاہی حکیم موٹا پا کم کرنے کے لیے خوراک کم کرنے کا مشورہ دینے کی سزا بھگت رہا ہے۔ بادشاہ نے حکیم سے کہا:

”تم دوا تجویز کرو جس سے بغیر کسی مشقت اور تکلیف کے مسئلہ حل ہو جائے۔“ کچھ سوچنے کے بعد حکیم نے جواب دیا:

”مجھے ایک دن کی مہلت دی جائے تاکہ ستاروں کی چال کے مطابق میں دوا تجویز کر سکوں۔“



نے بادشاہ سے جان کی امان پاتے ہوئے افسردگی سے کہا:

”میں نے رات بھر ستاروں کی چال پر غور کیا اور آپ کا زائچہ بنایا تو معلوم ہوا کہ آپ کی زندگی صرف ایک مہینے کی رہ گئی ہے۔ اس کے بعد آپ اس دُنیا میں نہیں ہوں گے۔ بادشاہ سلامت میں نے آپ کے لیے بہترین دوا تجویز کی ہے۔ اجازت ہو تو علاج شروع کروں، مگر فی الحال میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ علاج معالجے کے چکر میں پڑے بغیر ایک مہینے میں دُنیا کی نعمتوں سے خوب لطف اندوز ہوں۔“

پھر بادشاہ نے دربار برخواست کر دیا۔ جب تمام درباری چلے گئے تو بادشاہ نڈھال ہو کر تخت پر گر پڑا۔ اسے اپنی موت ایک ماہ کے فاصلے پر دکھائی دینے لگی تھی، اتنی بڑی سلطنت کا بادشاہ ہونے کے باوجود وہ خود کو بے بس اور تنہا محسوس کر رہا تھا۔ وہ جینا بھی چاہتا تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ کسی بھی انسان کے لیے موت سے فرار ممکن نہیں، اس کی پرہیزگار آنکھیں چھت کو تک رہی تھیں۔

اب بادشاہ کی زندگی یکسر بدل چکی تھی۔ اس نے شاہی حکیم کو رہا کر دیا۔ پھر وہ شاہی محل چھوڑ کر مسجد میں مقیم ہو گیا اور ہر دم یادِ الہی میں مشغول رہنے لگا۔ ملکہ اُسے صرف چند لقمے کھلانے میں کامیاب ہوتی۔ موت کے غم میں بادشاہ روز بروز کمزور ہو رہا تھا۔ وہ ایک ایک منٹ، ایک ایک گھنٹہ اور ایک ایک دن گن گن کر گزارتا۔ اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا اور بادشاہ دبلا پتلا ہو گیا۔ تیسویں دن اس نے دانا حکیم سے پوچھا: ”کیا آج میں واقعی مر جاؤں گا۔“

دانا حکیم نے جواب دیا:

”اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔ میری حیثیت ہی کیا ہے کہ غیب کے حالات جان سکوں، غیب کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ دراصل میرے پاس آپ کے علاج کے لیے اس کے سوا اور کوئی ترکیب نہیں تھی کہ آپ پر فکر مسلط کروں اور موت کی فکر کے علاوہ کوئی ایسی فکر نہیں کہ جو انسان کو راہِ راست پر لا سکے۔ میرے خیال میں آپ نے ایک ماہ میں نہ صرف اپنا وزن کم کیا بلکہ اور بہت کچھ بھی حاصل کیا ہے، میری دُعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔“

عقل مند حکیم کی بات سن کر بادشاہ کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے حکیم کو وزیرِ اعظم بننے کی پیشکش کی، لیکن حکیم نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میری جھونپڑی مجھے محلات سے زیادہ عزیز ہے، تاہم اگر بادشاہ عدل سے حکومت کرے تو وہ ہر لمحہ بادشاہ کی مدد کو تیار رہے گا۔ پھر دانا حکیم دربار سے چلا گیا۔

(تیسرا انعام: 90 روپے کی کتب)

☆.....☆.....☆

سنہ ۱۹۹۵ء



ارفع کریم رندھاوا

ناشتے کی میز پر ہوئی تھی۔ یہ بچی کوئی اور نہیں بلکہ ارفع کریم رندھاوا تھی، جس نے صرف نو سال کی عمر میں مائیکروسوفٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ اُس ذہین بچی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں مہارت کے لیے استعمال کیا اور دُنیا کی سب سے کم عمر آئی ٹی انجینئر کہلائی۔

2 فروری 1995ء کو ارفع کریم نے فیصل آباد کے گاؤں رام دیوالی میں آنکھ کھولی۔ اُن کے والد احمد کریم رندھاوا کا تعلق فوج سے ہے۔ جب اُس کی عمر پانچ سال تھی تو ایک روز اُس نے پہلی بار اچانک سوفٹ ویئر بنا لیا اور اپنی سہیلی سے کہا: ”اس کا بٹن دباتے ہی ایک حیرت انگیز دُنیا آپ کے سامنے ہوتی ہے۔“

غلام حسین میمن

اُن دنوں اُن کے والد امجد کریم اقوام متحدہ کی امن فوج کے تحت افریقہ میں تھے۔ اُس نے مزید کمپیوٹر تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُن کے والد نے خصوصی توجہ دی اور اُسے کمپیوٹر پر دسترس حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن مواقع فراہم کیے۔ اُس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ ایک روز یہ بچی کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی دُنیا میں اپنا نام روشن کرے گی۔

کمپیوٹر کو بیسویں صدی کی سب سے بڑی ایجاد کہا جاتا ہے۔ اور کیوں نہ کہا جائے کہ اس کی بہ دولت زندگی میں بے حد آسانیاں پیدا ہوئی ہیں جس کی ایک طویل فہرست ہے۔ ہمارے ہاتھوں میں موجود موبائل فون کی ایجاد اس کی بدولت ہی ہے۔ کمپیوٹر ایک ایسی دُنیا ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ ہر آنے والا دن اس میں جدت لا رہا ہے۔ انٹرنیٹ، ویب سائٹ، ای میل اور فیس بک سمیت ہم کمپیوٹر سے کئی فوائد حاصل کر رہے ہیں۔

بل گیش کو آج کمپیوٹر کی دُنیا کا اہم ترین فرد سمجھا جاتا ہے۔ مائیکروسوفٹ ہیڈ کوارٹر امریکہ میں موجود یہ عظیم انسان اپنی انسانی خدمات کی بدولت آج پوری دُنیا میں مقبول ہے۔ اسی مصروف انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر اس کے دس ہزار ڈالر زمین پر گر جائیں تو وہ اُسے اُٹھانے کے لیے نہیں جھکے گا بلکہ اتنی دیر میں وہ اس سے زیادہ ڈالر کما چکا ہوگا۔ اس مصروف انسان نے چند سال قبل ایک پاکستانی نو سالہ بچی کو ملنے کے لیے اپنے ہیڈ کوارٹر بلایا اور اس سے مل کر خوشی کا اظہار کیا۔ اُن کی یہ ملاقات

اب اسے پاکستان کے مختلف تعلیمی اداروں میں لیکچرز کے لیے بلایا جانے لگا۔ وہ ایک ذہین بچی تھی جو بولنے کے لب کھولتی تو معلومات کا انبار لفظوں کی صورت میں چلا آتا اور سننے والا حیران ہوئے بغیر نہ رہتا۔ وہ کہتی تھی کہ میری زندگی کا مقصد پاکستان اور اپنے آبائی گاؤں رام دیوالی میں لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے اچھا تعلیمی ادارہ قائم کرنا ہے اور وہاں کمپیوٹر کی لیبارٹری بنانا ہے تاکہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے نئے ماہر پیدا ہوں اور ہمارا ملک ترقی کرے۔ اُس کا ایک خواب یہ بھی تھا کہ وہ دُنیا کی بڑی بڑی جامعات میں جائے اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اسے دو ہفتوں کے لیے دئی بلایا گیا جہاں اسے دُنیا کی

مختلف بڑی کمپنیوں نے ایوارڈ اور میڈل سے نوازا۔

دینی قیام کے دوران اس نے ایک فلائنگ کلب میں ہوائی جہاز اڑانا سیکھا اور محض دس برس کی عمر میں دنیا کی کم عمر ترین پائلٹ بن گئی۔ 2006ء میں جب اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ اسے بارسلونا (اسپین) ٹیکنالوجی ایجوکیشن ڈیولپرز کانفرنس میں بلایا گیا۔

لگتا تھا کہ اُس کے ذہن میں بھی ایک کمپیوٹر موجود تھا جو ہر ہر لمحے کا حساب رکھ رہا تھا۔ پی ٹی وی کے ایک انٹرویو میں جب توثیق حیدر نے اُسے کہا کہ مائیکروسوفٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل بننے وقت اُس کی عمر 9 سال ہی تھی نا..... تو اُس نے فوراً صبح کراتے ہوئے کہا: ”9 سال 9 مہینے گیارہ دن 6 گھنٹے 10 منٹ اور 2 سیکنڈ۔“

اُس کی ذہانت اور خدمات کا اعتراف پاکستان میں بھی کیا گیا۔ 2/ اگست 2005ء کو اسے سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں ”فاطمہ جناح گولڈ میڈل“ دیا گیا۔ 14/ اگست 2005ء کو سلام پاکستان ایوارڈ اور 23/ مارچ 2006ء کو اُسے صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی دیا گیا۔

2006ء میں اُس کی بل گیٹس سے دوبارہ ملاقات ہوئی اُس وقت وہ گیارہ سال کی تھی۔ ذرا سوچئے یہ عمر تو اُس کی اپنی سہیلیوں کے ساتھ گپ شپ کرنے اور مختلف تفریحی مقامات پر سیر کرنے کی تھی، مگر قوم کی اس قابلِ فخر بیٹی نے خود کو کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے مصروف رکھا۔ بلاشبہ وہ پاکستانی قوم کی قابلِ فخر بیٹی تھی۔

22/ دسمبر 2011ء کو جب وہ اچانک بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئی تو ساری قوم کے ہاتھ دُعا کے لیے اٹھ گئے۔ اسی دوران بل گیٹس تک بھی یہ اطلاع پہنچی تو اُس نے بے چینی کا اظہار کیا اور دنیا کی اس کم عمر آئی ٹی انجینئر کے لیے ڈاکٹروں کا ایک پینل بنایا جو ہر وقت پاکستانی ڈاکٹروں سے رابطے میں تھا۔ اُس نے ہر ممکن تعاون کا بھی یقین دلایا۔

14/ جنوری 2012ء کو رات 9 بج کر 50 منٹ پر پوری قوم نے یہ افسوس ناک خبر سنی کہ دنیا بھر میں پاکستان کا نام روشن کرنے

والی ارفع کریم رندھاوا اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ 2/ فروری 2012ء کو اس کی سولہویں سالگرہ تھی وہ اس سے پہلے ہی دنیا سے منہ موڑ کر چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے وہ خواب بھی ادھورے رہ گئے جو اُس نے ملک میں کمپیوٹر تعلیم اور سافٹ ویئر کو عام کرنے کے لیے دیکھے تھے۔ وہ دیہاتوں میں کمپیوٹر کی تعلیم عام کرنا چاہتی تھی تاکہ ملک میں اس کی طرح کے آئی ٹی ماہرین پیدا ہو سکیں۔ وہ پاکستان میں گوگل کی طرح ڈی جی کون ویلی قائم کرنا چاہتی تھی۔ ارفع کریم تو مٹی میں جاسوئی مگر اس کے خواب ابھی زندہ ہیں۔ اب اسے حقیقت کا روپ دینا ہم سب کا فرض ہے۔ آپ بھی اپنی تعلیم پر بھرپور توجہ دیں اور اپنے اور ملک کا نام روشن کریں۔

اُس نے ایک انٹرویو میں نئی نسل کو پیغام دیتے ہوئے کہا تھا: ”اگر آپ اپنی زندگی میں بڑا کام کرنا چاہتے ہیں تو یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ شرمندگی یا گھبراہٹ کو اپنی زندگی سے نکال دیجیے۔ اگر آپ علم حاصل کرنے میں شرم محسوس کرتے ہیں تو آپ کے عمل میں بھی جھجک ہوگی۔ حوصلے سے کام لیتے ہوئے گھبراہٹ کو قریب نہ آنے دیں۔“

اُس کے انتقال کے بعد اُسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے آئی ٹی میڈیا سٹی کراچی پروجیکٹ کو ارفع کریم رندھاوا کے نام منسوب کیا گیا۔ وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف نے لاہور ٹیکنالوجی پارک کا نام تبدیل کر کے ارفع سوفٹ ویئر ٹیکنالوجی رکھ دیا۔ جدہ میں پاکستان انٹرنیشنل سکول کی آئی ٹی لیب کا نام ارفع کریم رندھاوا آئی ٹی لیب کر دیا گیا۔ اس نے نومبر 2006ء میں اسپین کے شہر بارسلونا میں منعقدہ ایک کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ 5000 مندوبین میں وہ واحد بچی تھی جو پاکستان کی نمائندگی کر رہی تھی۔ حال ہی میں اُس کے سوفٹ ویئر ٹیکنالوجی پارک کو اُس کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ بلوچستان یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی انجینئرنگ مینجمنٹ سائنسز (بیوٹمس) کے تکتو کیمپس میں قائم ایکسپوننٹر کو مرحومہ ارفع کریم کے نام منسوب کر دیا گیا ہے۔

پاکستان کے محکمہ ڈاک نے بھی اُس کی سولہویں سالگرہ پر 2/ فروری 2012ء کو خوب صورت یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا تھا۔



ریت اور پتھر

اولیس احمد

دو دوست کسی کام کے لیے سفر کے لیے نکلے، لیکن راستہ بھول گئے۔ کمر پر لٹکائے ہوئے تھیلوں کے بوجھ اور گرمی کی شدت سے بے حال وہ ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ دونوں میں کسی معمولی سی بات پر اختلاف ہو گیا۔ تلخی اس قدر بڑھی کہ ایک دوست نے غصے میں آ کر دوسرے کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ انگلیوں کے نشانات اس کے چہرے پر نمایاں ہو گئے۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ دانتوں پر لگنے والی چوٹ کی سخت تکلیف سے وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک وہ ریت پر بیٹھا اپنا گال سہلاتا رہا۔ کچھ دیر بعد بیٹھے بیٹھے اُس نے اپنی انگلی سے ریت پر لکھا: ”آج میرے بہترین دوست نے جس کی میں نے ہمیشہ عزت کی ہے، ایک معمولی سی بات پر مجھے تھپڑ مارا ہے۔“ وہ کچھ دیر تک اپنی لکھی ہوئی تحریر کو دیکھتا رہا اور پھر خاموشی سے اٹھا اور کوئی بات چیت کئے بغیر دوست کے ساتھ منزل کی تلاش میں چل پڑا۔ چند گھنٹوں کے بعد انہیں کامیابی ملی۔ وہ ہانپتے کانپتے مگر خوشی سے اچھلتے ہوئے ساحل سمندر پر پہنچ گئے۔ کچھ دیر سستانے کے بعد وہ جسم کی میل کچیل اتارنے اور تازہ دم ہونے کے لیے سمندر میں دُور تک اتر گئے۔ اچانک سمندر کی تیز لہر ابھری اور وہ دوست جس کو تھپڑ مارا گیا تھا سمندر کی تیز لہروں میں بہہ کر ڈوبنے لگا۔ اُسے ڈوبتا دیکھ کر دوسرا دوست اپنی جان کی پروا کیے بغیر سمندر کی تیز لہروں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کے پیچھے کود پڑا اور تیز لہروں کے خلاف جدوجہد کرتا ہوا دوست کی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا اور اسے کندھوں پر اٹھا کر ساحل پر پہنچا۔ اُسے آرام سے لٹایا اور اس کے جسم اور پیٹ سے پانی نکالا۔ کافی دیر بعد جب ڈوبنے والے دوست کو ہوش آیا تو

وہ کچھ دیر لیٹے ہوئے اپنے دوست کی طرف احسان مندی سے دیکھتا رہا۔ جب کچھ قوت بحال ہوئی تو وہ خاموشی سے اٹھا اور اپنے سفری تھیلے سے چاقو نکال کر ایک طرف چلنے لگا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے وہ دُور پڑے ایک بڑے سے پتھر کے قریب رکا اور چاقو سے اس پر کچھ لکھنے کے بعد سمندر کی نرم ریت پر لیٹ گیا۔ دوسرا دوست کچھ انتظار کرنے کے بعد اپنے دوست کو دیکھنے چلا گیا۔ قریب پہنچا تو سامنے پڑے ہوئے پتھر پر کھدا ہوا تھا: ”آج میرے دوست نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر خود کو انتہائی خطرے میں ڈالتے ہوئے میری جان بچائی ہے۔“ پتھر پر لکھی ہوئی یہ عبارت پڑھنے کے بعد اس نے حیرت سے اپنے دوست سے پوچھا: ”جب صحرا میں بھٹکتے ہوئے تلخ کلامی سے غصہ میں آ کر میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا تو میرا تھپڑ کھانے کے بعد تم نے ریت پر کچھ اور لکھا تھا لیکن کیا وجہ ہے کہ تم نے کمزوری کی حالت کے باوجود اتنی دُور ریت پر پیدل چلتے ہوئے پہلے پتھر ڈھونڈا اور اس پر یہ تحریر لکھی؟“ اس نے اپنے دوست کی طرف احسان مند نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا: ”جب ہمیں کسی کے عمل یا رویے سے تکلیف پہنچے تو اس کا اظہار ریت پر لکھ کر کرنا چاہیے کیوں کہ ریت پر لکھا ہوا تو عارضی ہوتا ہے جسے وقفے وقفے سے چلنے والا تیز ہوا کا کوئی ایک جھونکا چند منٹوں بعد مدھم کر دے گا اور اس کی شناخت نہ ہو سکے گی۔ اس کے برعکس جب کوئی تم پر احسان کرے، تمہاری مدد کرے تو ایسا کرنے والے کے عمل کو اس طرح دل پر نقش کر لو کہ تیز ہوا، شدید آندھی، طوفان اور ماہ و سال کی گردش بھی اسے کم نہ کر سکے۔“

☆.....☆.....☆



- 8- حضور ﷺ نے ہجرت مدینہ کی اطلاع سب سے پہلے کسے دی تھی؟
 ا- حضرت ابوبکر صدیقؓ ii- حضرت عمر فاروقؓ iii- حضرت علی مرتضیٰؓ
 9- ہجرت کے موقع پر کفار مکہ نے حضور ﷺ کی گرفتاری کے لیے کتنا انعام مقرر کیا تھا؟

ا- سو درہم ii- سواشریاں iii- سواونٹ

10- حضور ﷺ کو کس سن عیسوی میں نبوت عطا ہوئی تھی؟

ا- 610ء ii- 612ء iii- 615ء

جوابات علمی آزمائش دسمبر 2012ء

- 1- اللہ تعالیٰ کی نشانیاں 2- حج 3- زبور 4- فن قرأت 5- جگر۔
 6- فارن ہائیٹ 7- لیزر شعاعیں 8- موہنجو داڑو 9- فالج 10- ڈائمنڈ
 اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے
 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔
 ☆ جواد معاویہ، اٹک (150 روپے کی کتب)
 ☆ عائشہ مجید، لاہور (100 روپے کی کتب)
 ☆ روچین زمان، کرک (90 روپے کی کتب)
 دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
 فائقہ ملک، محمد عاطف چاند، زینب صدیقی، لاہور۔ ارینا آفتاب، ربیعہ
 اقبال، کراچی۔ محمد شکیل بھٹہ، ملتان۔ سیف اللہ آرائیں، قصور۔ آمنہ
 عرفان، راول پنڈی۔ محمد محسن علی قادری، خدیجہ نشان، حسن رضا سردار،
 کاموکی۔ مصباح مسرت، اوکاڑہ۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ حبیب
 الرحمن، غنی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عون عثمان، شیخوپورہ۔ شہزادی خدیجہ شفیق،
 لاہور۔ یحییٰ محمود، فیصل آباد۔ محمد معیز احمد قادری، کاموکی۔ حافظ محمد مدثر
 چغتائی، ملتان۔ سید اشہد بخاری، دریا خان۔ سانیہ قادری، ملتان۔ جنید نعیم
 دیوان، حویلی لکھا۔ محمد سالار مہدی، جہلم۔ محمد عمر معاذ، بہاول پور۔ ایمان
 فاطمہ، راول پنڈی۔ محمد سمیع اللہ صادق، گوجرانوالہ۔ جواد احمد، لاہور۔
 مصباح نور، اوکاڑہ۔ نعمت اللہ کاکڑ، محمد ذیشان علی، سرانے عالم گیر۔ عبداللہ
 بن نعیم، راجہ فیضان رخسار، محمد حسن علی، جہلم۔ ثمرن عظیم، اسلام آباد۔
 ہدیٰ عمر، لاہور۔ محمد جنید انجم، چونیاں۔ عمیز احمد، جہلم۔ عبدالحمید،
 ڈیرہ غازی خان۔ مظہر عباس صدیقی، کبیر والا۔ عمارہ حسن، اسلام آباد۔
 منیبہ عدنان، صداقت علی، ایمان زہرا، لاہور۔ ایمن کائنات،
 ڈیرہ غازی خان۔ محمد شمیم عالم، اوکاڑہ، محمد زبیر ارشد، ملتان۔ ☆☆

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1- حضور ﷺ کا سلسلہ نسب کس نبی سے ملتا ہے؟

ا- حضرت نوحؑ ii- حضرت ابراہیمؑ iii- حضرت اسحاقؑ

2- آپ ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے کتنے دنوں بعد آپ ﷺ کا نام محمد ﷺ رکھا؟

ا- سات دن بعد ii- دو دن بعد iii- پانچ دن بعد

3- آپ ﷺ کا نام احمد ﷺ کس نے رکھا تھا؟

ا- چچا ii- پھوپھی iii- والدہ ماجدہ

4- حضور ﷺ کے کس نام کا لغوی مطلب ”ممدوح“ (تعریف کیا ہوا) ہے؟

ا- محمد ﷺ ii- احمد ﷺ iii- سید المرسلین ﷺ

5- جب آپ ﷺ کو حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے حوالے کیا گیا تھا اُس وقت آپ ﷺ کی عمر کتنی تھی؟

ا- دس دن ii- آٹھ دن iii- بارہ دن

6- حضور ﷺ کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا، قریش کا لغوی مطلب کیا ہے؟

ا- بڑی بستی ii- بڑا دریا iii- بڑی مچھلی

7- نبی کریم ﷺ کے ان چچا کا نام بتائیے جو آپ ﷺ کے رضاعی بھائی بھی تھے؟

ا- حضرت حمزہؓ ii- حضرت عباسؓ iii- حضرت زبیرؓ

مگر ابھی تک مجھے انعام نہیں ملا۔ اس بارے میں کچھ بتائیے۔

(اسد علی انصاری، ملتان)

☆ آپ کو انعام بھیجا گیا تھا جو پتہ درست نہ ہونے کے باعث واپس آ گیا تھا۔

ننھا مالی، ہمیں کھونہ دینا اور قصہ ایک ادھار کا اچھی کہانیاں تھیں۔

(عبداللہ بن نعیم، ملٹری کالج جہلم)

دوسرا موتی، قصہ ایک ادھار کا، حلوے کی خوش بو اور انوکھا مقابلہ بہترین کہانیاں تھیں۔ ناول ”انوکھی دُنیا“ ہر قسط میں تجسس سے بھرپور ہوتا ہے۔ (شمالہ فضل کریم، راول پنڈی)

بچوں کا انسائیکلو پیڈیا، سنہرے لوگ، اوجھل خاکے اور کھیل دس منٹ کا میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ (نعمت اللہ کاکڑ، جہلم)

دسمبر کا شمارہ زبردست تھا۔ کہانیوں میں شہزادی عنبر اور مکڑے، کڑوی روٹی اور ننھا مالی اچھی کہانیاں تھیں۔ (ابرار حسن، ملٹری کالج جہلم) انکل! میں سلسلہ ”آپ بھی لکھئے“ کے لیے ایک تحریر بھیج رہا ہوں، اسے ضرور شائع کیجئے گا۔ (علی شہروز، فیصل آباد)

☆ تحریر معیاری ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔

”تعلیم و تربیت“ کے تمام سلسلے عمدہ ہیں۔

(عمر حیات وزیر، شمالی وزیرستان)

پیارے اللہ کے پیارے نام اور کھوج لگائیے مفید سلسلے ہیں۔

(حمیز احمد، سرانے عالم گیر)

دسمبر کے شمارے میں شہزادی عنبر اور مکڑے، چچا تیز گام نے گاڑی چلائی اچھی کہانیاں تھیں۔ ناول ”انوکھی دُنیا“ اپنے موضوع کے اعتبار سے واقعی انوکھا ہے۔ (عالیہ اقبال، پشاور)

اشتیاق احمد کی کہانی ”دوسرا موتی“ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔

اس مرتبہ کا سرورق بھی عمدہ تھا۔ (ذیشان مجید، عائشہ مجید، لاہور)

چچا تیز گام نے گاڑی چلائی، عظیم رہبر، شہزادی عنبر اور مکڑے، شہید مرتے نہیں اور سیاہ ٹوپی والا عمدہ کہانیاں تھیں۔

(عزیز احمد، نوشہرہ)

”تعلیم و تربیت“ ایک بہترین رسالہ ہے۔ اس میں شائع کہانیاں

بہت اچھی ہوتی ہیں۔ (محمد نعیم امین، لاہور)

”اوجھل خاکے“ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ (آمنہ حیات، لاہور)

دسمبر کے شمارے میں تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ (آمنہ سعید، دینہ)

اس مرتبہ سرورق بہت عمدہ تھا۔ (ترکین فاطمہ، ملتان)

چچا تیز گام نے گاڑی چلائی، کڑوی روٹی اور ننھا مالی عمدہ تحریریں تھیں۔ (نمرہ ندیم، لاہور)

میں ”تعلیم و تربیت“ اپنے بچپن میں پڑھا کرتا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ رسالہ اب بھی اپنے اعلیٰ معیار کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

(محمد اکرم صدیقی، میاں والی)

چچا تیز گام نے گاڑی چلائی، حلوے کی خوش بو، شہزادی عنبر اور مکڑے اور پٹ پٹ پٹا کی واپسی بہترین کہانیاں تھیں۔

(کاشف حیات، اقراء خان، لاہور)

خوب صورت، دوسرا موتی، شہید مرتے نہیں، شہزادی عنبر اور

مکڑے اور چچا تیز گام نے گاڑی چلائی بہت اچھی کہانیاں تھیں۔

(محمد ثاقب، جہلم)

دسمبر کا ”کہانی نمبر“ بہت پسند آیا۔

(عثمان علی، محمد حذیفہ انوار، جھنگ)

کہانیوں میں آپ کے کرداروں کا طرزِ مخاطب بہت اچھا ہے جس سے بچوں کو یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں سب کو ادب سے مخاطب کرنا

چاہیے۔ (عمارہ حسن، اسلام آباد)

حلوے کی خوش بو، انوکھا مقابلہ، پرکام کروں گا بڑے بڑے اور خوب صورت اچھی کہانیاں تھیں۔

(زینب علی جعفری، حسین ابن علی جعفری، اسلام آباد)

دسمبر کے شمارے میں خوب صورت، سیاہ ٹوپی والا اور قصہ ایک

ادھار کا کہانیاں اچھی تھیں۔ (بلال حسین، اسلام آباد)

اس مرتبہ سرورق نے دل موہ لیا۔ کہانی کڑوی کہانی نے مزہ دو بالا

کر دیا۔ (شمیم عالم، اوکاڑہ)

دوسرا موتی، کڑوی روٹی، شہزادی عنبر اور مکڑے، قصہ ایک ادھار کا

اچھی کہانیاں تھیں۔ (محمد احمد رضا انصاری، کوٹ ادو)

چچا تیز گام نے گاڑی چلائی اچھی کہانی تھی۔

(زرقا وقار، لاہور)

سلسلہ ”قند مکر“ شروع کر کے آپ نے ہمارے دل جیت لیے

ہیں۔ (محمد زبیر ارشد، ملتان)



انوکھی دُنیا

ظفر حسنین

راجو نے آنکھیں ملتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ بیرک میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ پہرے دار بھی شاید کہیں سو رہا تھا۔ جگو، یاد اور اختر بھی خراٹے بھرتے ہوئے سو رہے تھے۔

”راجو! اٹھو..... یہ..... یہ میں ہوں روشنی..... اٹھو آنکھیں کھولو۔“ روشنی نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

”روشنی۔“ راجو نے دہرایا۔

”ہاں میں روشنی ہوں، میرے ساتھ رانی اور ڈولی بھی ہیں۔“ پھر روشنی نے ڈولی کے بارے میں راجو کو بتایا۔ راجو کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ یاد نے کروٹ لی تو راجو نے فوراً تینوں کتابوں کو تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ کوئی خطرے والی بات نہیں ہے تو اُس نے انہیں تکیے کے نیچے سے نکال لیا۔

”تم تینوں یہاں کیوں آئی ہو؟“ راجو نے سوال کیا۔

”راجو! یہ جگہ تم جیسے اچھے انسان کے لیے نہیں ہے۔“ ڈولی نے جواب دیا۔

”میں اچھا انسان نہیں ہوں۔“ راجو کے لہجے میں دکھ تھا۔

”جو انسان کتابوں سے محبت کرتا ہے وہ بُرا ہو ہی نہیں سکتا، تم وقتی طور پر راستے سے بھٹک گئے ہو، تم جب نیکی کے راستے پر چلنے لگو گے تو اچھے انسان بن جاؤ گے، ایسا کرنا تھوڑا سا مشکل ضرور ہو گا، مگر ایسا کرنا ناممکن نہیں ہے، یہ دُنیا تمہاری دُنیا نہیں ہے، واپس لوٹ آؤ اپنی دُنیا میں۔“ ڈولی نے تو گویا اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

”میں خود اس

دلدل سے نکلتا

چاہتا ہوں۔“

راجو کی بات سن

کر روشنی بولی۔

”جب انسان

اچھا کام کرنے کا

ارادہ کر لیتا ہے تو

اللہ تعالیٰ بھی اُس

کی مدد کرتا

ہے۔“ اس سے

قبل کہ راجو روشنی

کو کوئی جواب دیتا جگو نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

”تم ابھی تک سوئے نہیں۔“

”بس نیند نہیں آ رہی۔“ یہ کہتے ہوئے راجو نے کمال مہارت

سے تینوں کتابوں کو کمبل میں چھپا لیا تھا۔

”سو جاؤ کل بالے کی مرمت بھی کرنی ہے۔“ جگو نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر راجو خاموشی سے لیٹ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کتابوں کو

کہاں اور کس طرح چھپائے۔ یہ سوچتے ہوئے اُس کی نظر بیرک

کے باہر بنی اُس شیلف پر پڑی جہاں قرآن مجید اور دیگر اسلامی

کتب رکھی تھیں۔ اُس نے صبح تک تینوں کو تکیے کے نیچے چھپائے

رکھا پھر نماز فجر کے وقت جب اُس کے ساتھی سو رہے تھے وہ تینوں

کتب کو شیلف میں رکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”یہ جگہ تم تینوں کے لیے محفوظ ترین ہے۔“

”ہمیں اگر کہیں باہر بھی جانا پڑے گا تو ہم یہیں واپس آ جایا

کریں گی۔“ رانی نے کہا۔

”ہاں ایسا کرنا مناسب رہے گا۔“ راجو بولا۔

☆.....☆.....☆

ڈولی کافی دنوں سے گھر سے غائب تھی۔ وہ عمر کو کچھ بتا کر بھی

نہیں گئی تھی۔ وہ شیلف میں رکھی تمام کتابوں سے اُس کے بارے میں پوچھ چکا تھا، مگر وہ بھی عمر کی طرح لاعلم تھیں۔ ایک شام چپکے سے ڈولی واپس آ گئی۔ عمر اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اُس نے ڈولی سے پوچھا۔

”تم اتنے دن کہاں تھی؟“

”میں جیل میں تھی۔“

”کیا مطلب؟“ جیل کا سن کر عمر پریشان ہو گیا تھا۔

”مطلب یہ کہ میں روشنی اور رانی کے ساتھ جیل میں راجو کے پاس گئی تھی۔ راجو بہت اچھی سوچ کا مالک ہے، وہ وقتی طور پر بھٹک گیا ہے، وہ خود بھی جرائم کی دُنیا سے نفرت کرتا ہے اُس کی کوشش ہے کہ وہ جلد سے جلد اُس بُری دُنیا سے نکل آئے۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔“

”میں کل رات پھر جیل چلی جاؤں گی، رانی اور روشنی ابھی تک وہیں ہیں۔“ ڈولی بولی۔

”جب تم جیل سے واپس آ جاؤ گی تو میں تمہیں سکول لے کر جاؤں گا۔“ عمر بولا۔

”وہ کیوں؟“ ڈولی نے سوال کیا۔

”سر الطاف تم سے ملنا چاہتے ہیں، میں نے تمہارے بارے میں انہیں بتایا ہے۔“ عمر بولا۔

”میں تمہارے ساتھ ضرور سکول جاؤں گی۔“ ڈولی بولی۔

☆.....☆.....☆

”استاد! وہ..... وہ..... بھ..... بھ..... بھوت.....“ یاور سے بات بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔

”کہاں ہے بھوت؟“ جگو نے پوچھا۔

”وہ..... وہ..... استاد..... وہ اُس شیلف میں جہاں کتابیں ہیں..... بھوت..... بھوت ہے..... وہ بھوت..... جو ہمارے اڈے پر تھا۔“ یاور بولا۔

”کیا بکتے ہو، آؤ میرے ساتھ میں بھی تو دیکھوں کہ کہاں ہے بھوت، آؤ میرے ساتھ۔“ جگو نے یاور کو گھورتے ہوئے کہا۔

ڈولی، روشنی اور رانی یاور کی باتیں سن چکی تھیں۔ تینوں نے بجلی

کی سی تیزی کے ساتھ شیلف سے چھلانگ لگائی اور جیل سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں داخل ہو گئیں۔ اُس وقت آفس میں کوئی موجود نہ تھا۔ دائیں طرف دیوار کے ساتھ رکھے ایک میز پر بہت سی کتابیں اور فائلیں رکھی تھیں۔ تینوں فائلوں کے اندر جا کر چھپ گئیں۔ اب وہ محفوظ تھیں۔

”کہاں ہے بھوت، دکھاؤ مجھے، کہاں ہے بھوت؟“ جگو نے ناخوش گوار انداز میں یاور کو گھورتے ہوئے کہا۔

”یہیں تھیں وہ تینوں کتابیں، ہاں میں نے خود اپنی آنکھوں سے انہیں اس شیلف میں دیکھا ہے۔“ یاور پر طاری خوف اب قدرے کم ہو گیا تھا۔

”مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی کہ تمہیں اور اختر کو کیا ہو گیا ہے، جگو کے شاگرد ہوں اور کتابوں سے ڈر جائیں، یہ شرم کی بات ہے، یہاں کوئی بھوت نہیں ہے۔“

”وہ استاد میں نے خود.....“

”بس..... بس اپنی زبان بند رکھو، میں اب تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا، چلو آؤ بالے سے بھی دو دو ہاتھ کر لیں۔“

تھوڑی دیر بعد جگو جیل میں بنی گراؤنڈ میں موجود تھا۔ قیدی وہاں دھوپ میں بیٹھے تھے۔ جگو ایک طرف بیٹھ کر بالے کو گھورنے لگا۔

”ابے کیا دیکھتے ہو۔“ بالے نے بلند آواز میں جگو کو مخاطب کیا۔

”میں دیکھ رہا ہوں تم نے پُر پُرے نکالنے شروع کر دیئے ہیں، ادھر آؤ اور میرے پاؤں دباؤ، تم نے کافی دنوں سے ہماری خدمت نہیں کی۔“ جگو قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔“ بالا غڑایا۔

”اچھا تم میرے نوکر نہیں ہو، تم بھول رہے ہو یہاں صرف اور صرف جگو کی حکومت ہے، آؤ اور ہمارا حکم مانو، اٹھو اپنی جگہ سے ورنہ تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔“ جگو چلا یا۔

یاور اور اختر، جگو کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ راجو ان سے تھوڑے فاصلے پر پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ جب بالا، جگو کے

”اپنی زبان بند رکھو، یہاں تمہاری نہیں، جگو کی حکومت ہے جگو کی حکومت، سمجھ آئی یہ بات، آئندہ اپنے کام سے کام رکھنا، تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو، میں کبھی کسی کو معاف نہیں کرتا۔“ جگو نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

شام کے وقت جگو، یاور، اختر، راجو اور بالا سپرنٹنڈنٹ یعقوب کے سامنے کھڑے تھے۔

یعقوب نے جگو کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
”تو تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے، تم مجھے جانتے نہیں ہو، میں نے تیس سال تک تمہارے جیسے بگڑے قیدیوں کو سیدھا کیا ہے۔“

”سرکار کو مجھ سے کیا شکایت ہے؟“ جگو نے نہایت عاجزی کا انداز اپنایا۔

”کوئی ایک شکایت ہو تو بتاؤں، قیدیوں کو مارتے پیٹتے ہو، میس کے ملازموں کو ہراساں کرتے ہو، تم نے اپنے ساتھ یاور اور اختر کو بھی ملا لیا ہے جب کہ راجو میں آنے والی تبدیلیوں کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے، تم بھی راجو جیسا بننے کی کوشش کرو۔“ سپرنٹنڈنٹ یعقوب کی بات سن کر جگو نے راجو کو گھورا۔

”مجھے جیل میں ہونے والی ایک بات کا علم ہے، جب کوئی قیدی جیل میں آ کر اپنی اصلاح کرتا ہے تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے، بہت کم قیدی مجھے یہ خوشی دینے کا باعث بنتے ہیں، بہت مدت کے بعد راجو نے مجھے یہ خوشی دی ہے، شکریہ راجو، بہت بہت شکریہ، شاباش راجو اسی راستے پر چلتے رہو، شاباش۔“

”شاباش راجو شاباش، ہمیں بھی بہت خوشی ہوئی ہے۔“
”یہ کون بولا ہے، یہ آواز کس کی ہے؟“ سپرنٹنڈنٹ یعقوب نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

(سپرنٹنڈنٹ یعقوب کے کمرے میں کون بولا تھا؟ یہ جاننے کے لیے اگلی قسط پڑھیے۔)



بلانے کے باوجود نہ آیا تو جگو کے اشارے پر یاور اور اختر، بالے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے اس پر تھپڑوں، گھونسوں اور مکوں کی بارش کر دی۔ سب قیدی اپنا کام چھوڑ کر لڑائی دیکھنے لگے تھے۔ کسی قیدی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ جگو کے بندوں کا ہاتھ روک سکیں۔ راجو نے آگے بڑھ کر مزاحمت کی۔ وہ اختر اور یاور کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”راجو! پیچھے ہٹ جاؤ۔“

”مت مارو اسے، اس کا قصور کیا ہے جو تم اسے اس طرح پیٹ رہے ہو؟“ راجو قدرے بلند آواز میں بولا۔

”اس کا یہ قصور ہے کہ یہ استاد جگو کے بلانے پر نہیں آیا، ہم اُس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ یہ کہہ کر یاور اور اختر پھر بالے کو پیٹنے لگے۔ بالا اپنا بچاؤ کرتا رہا تھا مگر وہ دونوں کے سامنے بے بس تھا۔ راجو کے آنے پر اس کی ڈھارس بندھی تھی۔ اُس نے یاور کو جب کہ راجو نے اختر کو قابو کر لیا تھا۔ جگو یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سپاہی وہاں پہنچ گئے یوں معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ جیل میں اس طرح کے واقعات کا ہونا معمول کی بات تھی۔ جگو نے راجو کو گھورتے ہوئے کہا۔

”راجو! تم نے ٹھیک نہیں کیا، ہماری بلی ہمیں ہی میاؤں۔“
”بالا بے قصور ہے۔“

گولی



تختے پر جا لگا تھا۔ اس کے دو روپے ضائع ہو گئے تھے۔
”کوشش کرو بچہ کوشش کرو، نشانہ لگانا ایک دن میں
تھوڑے ہی آ جاتا ہے، چلو ایک کوشش اور کرو۔“ خان
بابا نے کہا۔

پھر اُس نے منہ میں رکھے چھروں میں سے ایک چھرا
بندوق میں ڈال دیا۔ ریحان اب پھر نشانہ لگانے کے
لیے تیار تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ غبارہ پھوڑنے میں
ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ اُس نے تاک کر نشانہ
لگایا، مگر وہ غبارہ پھوڑنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔
ریحان کے بعد کئی اور بچوں نے غبارے پھوڑنے اور
پلاسٹک کے بندر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر ان
میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

”خان بابا! میرا خیال ہے بندوق کی نالی ٹیڑھی ہے،
جس کے باعث نشانہ اپنے اصل مقام پر نہیں لگتا۔“
ایک بچے کی بات سن کر خان بابا نے کہا۔

”نہیں میرے بچے ایسی بات نہیں ہے، بندوق کی نالی بالکل
سیدھی ہے، یہ دیکھو میں غبارہ پھوڑتا ہوں۔“ پھر خان بابا نے ان
کے سامنے غبارہ پھوڑا تو سب بچے حیران رہ گئے۔

”کل میں زیادہ پیسے لے کر آؤں گا اور زیادہ نشانے لگاؤں
گا۔“ ریحان نے کہا۔

”بچہ! میں ہر روز ادھر ہوتا ہوں، روزانہ نشانہ لگاؤ گے تو غبارہ
پھاڑنے میں کامیاب ہو جاؤ گے، بچہ لوگو آؤ..... نشانہ لگاؤ.....
انعام پاؤ۔“ خان بابا نے پھر آواز لگانا شروع کر دی تھی۔

دوسرے دن گراؤنڈ میں جانے کے بجائے ریحان اپنے
دوستوں کے ساتھ برگد کے نیچے خان بابا کے سامنے کھڑا تھا۔ آج
اُس کی جیب میں سو روپے کا ایک نوٹ تھا۔ شہریار جانتا تھا کہ
ریحان نے سو روپے کا یہ نوٹ کہاں سے حاصل کیا ہے۔ شام کے
وقت اس کے ابا اپنی ریڑھی لے کر گھر آئے تھے تو انہوں نے اپنی
قمیص اتار کر چارپائی پر رکھی تو ریحان نے اُس میں سے سو روپے کا
نوٹ نکال لیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ ان
روپوں سے نشانے بازی کرے گا اور انعام حاصل کرے گا۔ وہ اب

برگد کے درخت کے نیچے بچوں کی بھیڑ تھی۔ خان بابا ایک
تختے پر غبارے اور پلاسٹک کے بندر لگائے نشانہ بازی کے لیے
بیٹھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چھرے والی بندوق تھی۔ وہ مسلسل آواز
لگا کر بچوں کو نشانہ بازی کی ترغیب دے رہا تھا۔

”آؤ بچو آؤ..... نشانہ لگاؤ..... انعام پاؤ..... ایک غبارہ
پھوڑنے پر ایک چاکلیٹ ملے گی..... دو غبارے پھوڑنے پر پانچ
روپے انعام ملے گا..... آؤ بچو آؤ..... نشانہ لگاؤ۔“

”ایک نشانہ کتنے کا ہے؟“ ریحان نے پوچھا۔

”صرف دو روپے، دو روپے میں ایک نشانہ لگاؤ..... اور انعام پاؤ۔“
”یہ لو چار روپے۔“ یہ کہہ کر ریحان بندوق کندھے سے لگا کر
ایک آنکھ بند کر کے ایک غبارے کو نشانہ لگانے لگا۔ اس کے دوست
بھی اُس کو نشانہ لگانے کے بارے میں ہدایات دے رہے تھے۔

”ریحان! بندوق کی نالی کو سیدھا رکھو اور تاک کر نشانہ لگاؤ۔“
شہریار بولا۔

”تم فکر نہ کرو، میرا کوئی نشانہ خطا نہیں جائے گا۔“ یہ کہہ کر
ریحان نے بندوق کا ٹرائیگر دبایا تو چھرا غبارے کو لگنے کی بجائے

تک دس نشانے لگا چکا تھا، مگر کوئی نشانہ بھی ٹھیک جگہ پر نہ لگا تھا۔
آج اُسے پیسوں کی کوئی فکر نہ تھی۔

”اور چھڑے ڈالوں؟“ جب ریحان پندرہ نشانے لگا چکا تو
خان بابا نے پوچھا۔

”ہاں..... ہاں..... اور چھڑے ڈالو۔“ ریحان فوراً بولا۔

جب ایک غبارہ ٹھاہ کی آواز کے ساتھ پھوٹا تو ریحان اور اُس
کے دوستوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

”ریحان! مبارک ہو۔“ شہریار نے ریحان کو گلے لگاتے
ہوئے کہا۔

”بہت اعلیٰ۔“ شیراز نے ریحان کو تھپکی دی۔

ریحان نے اس کے بعد مزید کئی غبارے پھوڑے اور بندر کو
بھی نشانہ بنایا۔ اس کی جیب چاکلیٹ سے بھر گئی تھی۔ جب سو
روپے ختم ہو گئے تو ریحان اپنے دوستوں کو لے کر گراؤنڈ میں بیٹھ
گیا۔ سب کے ہاتھوں میں مزے دار چاکلیٹ تھی۔ ہر بچہ ریحان
کی نشانہ بازی کی تعریف کر رہا تھا۔ اب تو یہ ریحان کا روز کا
معمول بن گیا۔ اس کے ابا شام کو جب نان چنے کی ریڑھی لے کر
گھر آتے تو انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ ریحان ان کی جیب
سے پیسے نکال لیتا ہے۔ ایک دن شہریار نے دے دے لفظوں میں

چوری کیے پیسوں کے بارے میں کہا تو
ریحان بولا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ
باتیں چھوڑو، آج کالو گروپ سے ہمارا
مقابلہ ہے، آج انہیں ہر صورت ہرانا
ہے، بڑا آیا کالو، اس بستی میں مجھ سے
بڑا نشانے باز بھلا کوئی اور ہو سکتا ہے۔“
ریحان نے سینہ تان کر کہا۔

شہریار سمجھتا تھا کہ ریحان جو کچھ
کر رہا ہے غلط کر رہا ہے، وہ اُس کو
سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ اس کی
باتوں کو ہوا میں اڑا دیتا تھا۔ کچھ دیر بعد

ریحان گروپ اور کالو گروپ کے بچے آمنے سامنے کھڑے تھے۔
ریحان نے ناخوش گوار انداز میں کالو کو گھورا۔ کالو کا اصل نام بلال
تھا، کالی رنگت کے باعث سب اُسے کالو کہنے لگے تھے۔ اس کے
والد ایک باغ میں مالی تھے۔ وہ ایک سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔
کالو نے جب غبارہ پھوڑا تو اس کے حمایتوں نے تالیاں پیٹ کر
اور شور مچا کر خوشی کا اظہار کیا۔ اب ریحان کے کندھوں پر بھاری
ذمہ داری آن پڑی تھی۔ اس کے ساتھی بھی اس کی بھرپور حوصلہ
افزائی کر رہے تھے۔ ریحان کا پہلا نشانہ خطا گیا تھا۔ اس کی ناکامی
پر کالو گروپ کے حمایتوں کو خوشی منانے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

کالو کا نشانہ، دیکھے زمانہ..... کالو کا نشانہ، دیکھے زمانہ۔“ کالو
کے دوست رضا نے جب یہ نعرہ بلند آواز میں لگایا تو ریحان نے
آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”چھوڑو میرا گریبان۔“

”میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔“ یہ کہہ کر ریحان نے ایک
زوردار گھونسہ رضا کے منہ پر جڑ دیا۔ رضا چکرا کر رہ گیا۔ اُس نے
بھی جوابی حملہ کیا۔ دونوں طرف سے دوسرے بچے بھی اس لڑائی
میں کود پڑے تھے۔ خان بابا نے آگے بڑھ کر بیچ بچاؤ کروایا۔
”بچہ لوگو! یہ تو بہت بُری بات ہے۔ اپنے اپنے گھر جاؤ، میں





بھی یہاں سے جاتا ہوں..... تم بچہ لوگ آپس میں لڑائی کرے گا تو میں دوبارہ ادھر نہیں آؤں گا، آپس میں کھیلو، مگر لڑو مت..... گندے لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں، لڑو نہیں بابا..... آپس میں نہ لڑو۔“ خان بابا کی آواز رندھ گئی تھی۔

ریحان اور کالو ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ وہ بول تو کچھ نہیں رہے تھے مگر ان کے چہروں پر چھایا غصہ ان کی دلی کیفیت کو ظاہر کر رہا تھا۔ اُس دن کے بعد خان بابا نے کئی دن ادھر کا رخ نہ کیا۔ ریحان کو نشانہ لگانے کی تو گویا عادت سی ہو گئی تھی۔ خان بابا کے برگد کے نیچے نہ آنے کے باعث وہ پریشان سا تھا۔ اُس نے اس پریشانی کا حل ایک غلیل کی صورت میں نکالا تھا۔ اب ہر وقت اُس کے ہاتھ میں ایک غلیل ہوتی تھی۔ ایک دن اس کے بستے سے غلیل نکلی تو ماسٹر عبداللہ نے اُسے گھورا تھا۔

”تم آئندہ اگر غلیل سکول لائے تو میں تمہیں ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس لے کر جاؤں گا۔“

غلیل ماسٹر عبداللہ نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اُسی دن شام کے وقت ریحان نے نئی غلیل خرید لی تھی وہ اپنی غلیل سے کئی چڑیوں کو زخمی کر چکا تھا۔

عید کے میلے میں اُس کی نظر ایک پلاسٹک کے پستول پر پڑی تھی۔ پستول تھا تو پلاسٹک کا مگر وہ دیکھنے میں بالکل اصلی پستول جیسا لگتا تھا۔

”یہ پستول کتنے کا ہے؟“ ریحان نے پستول کو ہاتھ میں لے کر ایکشن لگاتے ہوئے دکان دار سے پوچھا۔

”دو سو روپے کا۔“ دکان دار بولا۔

”کچھ رعایت کر لو۔“

”یہ پستول دو سو روپے سے کم نہیں ملے گا، پستول لینا ہے تو لے لو ورنہ آگے بڑھو۔“ دکان دار کا لہجہ بہت تلخ تھا۔

اس سے قبل کہ ریحان کچھ بولتا ایک بچہ اپنے والد کے ساتھ وہاں آیا۔ وہ بچہ بھی پستول دیکھ کر مچل گیا۔

”پستول نہیں کوئی اور کھلونا لے لو۔“ باپ نے بچے کو سمجھایا۔

”نہیں میں پستول ہی لوں گا۔“ بچہ ضد کرنے لگا۔

”پستول تو گندے بچے چلاتے ہیں، اس میں استعمال ہونے

والی پلاسٹک کی گولیوں سے کوئی زخمی بھی ہو سکتا ہے، اگر یہ پلاسٹک کی گولی آنکھ میں لگ جائے تو آنکھ ضائع بھی ہو سکتی ہے۔“ باپ نے بچے کو سمجھایا تو بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ ایک بھالو لینے پر رضا مند ہو گیا تھا۔ دکان دار کی توجہ ان کی طرف تھی، ریحان نے موقع غنیمت جانا اور پستول لے کر ایک گلی کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

”پکڑو..... پکڑو..... میرا پستول لے گیا ہے..... پکڑو۔“

اس سے قبل کہ دکان دار شور مچاتا ریحان بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا اپنی بستی کی طرف نکل گیا تھا۔ خوف کے مارے اس کا دل تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت زرد ہو رہی تھی۔ وہ برگد کے نیچے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ پستول اُس نے اپنے کپڑوں میں چھپا لیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پستول کو کس طرح گھر لے کر جائے۔ امی اور ابا پستول دیکھ کر پوچھیں گے کہ یہ پستول کہاں سے لائے ہو۔ اس نے اس سوال کا جواب سوچ لیا تھا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو ابا آ چکے تھے۔ وہ

چارپائی پر بیٹھے دن بھر کی ریزگاری گن رہے تھے۔ ان کی نظر ریحان پر پڑی تو وہ فوراً بولے۔

”یہ پستول کہاں سے لائے ہو؟“

”یہ پستول میرا نہیں ہے، یہ تو میرے دوست شہریار کا ہے۔“

”تم اسے گھر کیوں لائے ہو، جاؤ اسے واپس دے کر آؤ۔“

ابا نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں کل شہریار کو پستول دے دوں گا۔“ ریحان بولا۔

”ٹھیک ہے میں کل اس پستول کو اپنے گھر میں نہ دیکھوں۔“

”جی ابا!“ ریحان یہ کہہ کر کمرے میں چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

ریحان نے کالا بیگ کھول کر جدید پستول نکال کر میز پر رکھا

تو اُس کے کانوں میں ایم آر کی آواز گونجی۔

”ایک گولی نشانے پر لگاؤ، ایک لاکھ روپیہ کماؤ۔“

”ایک لاکھ روپیہ۔“ ریحان نے دہرایا۔

”ہاں ایک لاکھ روپیہ، میں جانتا ہوں تمہارا نشانہ بہت اچھا

ہے، سب تمہیں یونہی نہیں ریحان گولی کہتے، گولی تو تمہارے حکم کی

غلام ہے، تم اُس کو جو حکم دو گے وہ فوراً تمہارا حکم مانے گی، گولیاں

چلاؤ، مال کماؤ، اپنی مہارت کا فائدہ اٹھاؤ۔“

ایم آر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ ایم آر تک اس

کی رسائی باؤ لطیف کے ذریعے ہوئی تھی۔ تعلیم تو وہ حاصل نہ کر سکا

تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد اُس نے کچھ عرصہ تو نان چنے کی

ریڑھی لگائی مگر پھر ریڑھی کو چھوڑ کر پستول ہاتھ میں پکڑ لیا۔ کسی

سے موٹر سائیکل چھینی اور کسی سے موبائل فون چھینا۔ باؤ لطیف بھی

اسی قبیل کا آدمی تھا۔ دونوں واردات کے لیے ایک بازار میں موجود

تھے کہ ان کی ملاقات ہو گئی تھی۔ ہوٹل میں چائے پینے کے بعد

باؤ لطیف نے کہا۔

”ان چھوٹی موٹی وارداتوں سے ہاتھ ہی کیا آتا ہے، کوئی لمبا

ہاتھ مارو، میں بھی پہلے اسی طرح کی وارداتیں کیا کرتا تھا پھر ایم آر

سے ملاقات ہو گئی اب مجھے ہر گولی چلانے کا پیسہ ملتا ہے۔“

باؤ لطیف نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

ریحان خاموشی سے باؤ لطیف کی باتیں سنتا رہا۔ چند گھنٹوں بعد

وہ ایم آر کے سامنے موجود تھے۔ ایم آر نے ریحان کو بغور دیکھا۔

دائیں طرف ایک شیشے کی بوتل لٹک رہی تھی۔ ایم آر نے پستول

ریحان کو دے کر بوتل کا نشانہ لگانے کے لیے کہا تو ریحان نے تاک

کر بوتل کا نشانہ لیا اور گولی مار کر بوتل کو کرچیوں میں بدل دیا۔

”ویری گڈ..... بہت اچھے، باؤ لطیف بہت کام کی چیز لائے

ہو، کیا ہمارے لیے کام کرو گے؟ پیسہ بھی ملے گا اور تحفظ بھی، بولو کیا

کہتے ہو۔“ ایم آر بوتل کی کرچیوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں تمہارے ساتھ کام کروں گا۔“ ریحان کی بات سن کر ایم

آر نے کہا۔

”تو آؤ ہمارے سینے سے لگ جاؤ، آج سے تم ریحان نہیں

ریحان گولی ہو، ریحان گولی۔“

ریحان جب وہاں سے نکلا تو اُس کے پستول کے میگزین میں

چھ گولیاں تھیں، یہ چھ گولیاں اس کے لیے چھ لاکھ روپے تھے۔ پھر

مارکیٹ کے قریب فائرنگ کر کے اُس نے چھ بے گناہ لوگوں کو موت

کی نیند سلا دیا تھا۔ صحافیوں کو بھی ریحان گولی کے بارے میں علم ہو

گیا تھا۔ فائرنگ کے فوراً بعد نیوز چینل پر ”بریکنگ نیوز“ چلنے لگی کہ

ریحان گولی نے فائرنگ کر کے چھ لوگوں کو قتل کر دیا۔

”ریحان گولی۔“ ریحان کے بچپن کے دوست شہریار نے یہ

بریکنگ نیوز سنی تو وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ برگد کے درخت

کے نیچے غبارے پھوڑنے سے لے کر غلیل سے چڑیوں کو مارنے

تک کی ایک ایک بات اُسے یاد آنے لگی۔ اسی اثناء میں اُس کا بیٹا

کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے نقلی پستول لہراتے ہوئے کہا۔

”ہینڈ ز اپ۔“

یہ سن کر شہریار کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا

اور اپنے بیٹے کے ہاتھ سے پستول چھین کر اُسے دیوار سے دے مارا۔

پستول ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اُس کا بیٹا حمزہ حیرت میں گم یہ

سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شہریار نے آگے بڑھ کر اُسے خود سے لپٹا لیا۔

”میرے بیٹے ان ہاتھوں میں پستول نہیں قلم اور کھلونے

ہونے چاہئیں۔“

نیوز چینل پر ریحان گولی کے حوالے سے بار بار بریکنگ نیوز نشر ہو رہی تھی۔ شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔
 ”میں ریحان گولی کو تلاش کروں گا، میں اُس سے ملوں گا۔“
 شہریار بڑبڑایا۔ حمزہ ابھی تک حیرت میں گم تھا۔

اگلے دن شہریار ریحان کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ گھر کی حالت بہت خستہ ہو چکی تھی۔ اس کی امی جان نے اُسے پہچان لیا تھا۔
 اُس نے جب ریحان کے بارے میں پوچھا تو وہ آہ بھر کر بولیں۔
 ”ریحان کبھی کبھار چوری چھپے رات کے وقت تھوڑی دیر کے لیے آ جاتا ہے، میں اس کی حرام کی کمائی میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتی، محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال لیتی ہوں۔“

”کیا ایسا ممکن ہے آئندہ جب ریحان آئے تو مجھے اطلاع کر دیجئے گا میں اُسی وقت آ جاؤں گا، یہ میرا وزیٹنگ کارڈ رکھ لیں اس پر میرا موبائل فون نمبر لکھا ہوا ہے۔“ شہریار بولا۔

☆.....☆.....☆

”شہریار بیٹا! ریحان آیا ہوا ہے اگر تم آ سکتے ہو تو آ جاؤ۔“
 ریحان کی امی جان نے پندرہ دن کے بعد شہریار کو فون کر کے اطلاع دی۔

”میں ابھی آتا ہوں، اُسے جانے نہ دیجئے گا۔“ شہریار نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔
 پھر آدھا گھنٹہ بعد وہ ریحان کے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

”اس وقت کون آ گیا ہے؟“ ریحان نے فوراً پستول نکال لیا۔
 ”گھبراؤ مت، تمہیں کوئی ملنے آیا ہے۔“
 ”کون ہے وہ؟“ ریحان نے فوراً پوچھا۔
 ”لو خود ہی دیکھ لو۔“ یہ کہہ کر امی جان نے دروازہ کھولا تو ریحان نے فوراً شہریار کو پہچان لیا تھا۔
 ”کیسے ہو ریحان؟“

”میں ریحان نہیں، میں تو ریحان گولی ہوں۔“ ریحان نے پستول اُس پر تان لیا۔

”میں یہاں ریحان گولی کو نہیں اپنے دوست ریحان کو ملنے آیا

ہوں۔“ شہریار نے کہا۔

”تم غلط جگہ پر آ گئے ہو۔“

”تم اب بھی ریحان گولی سے ریحان بن سکتے ہو خود کو قانون کے حوالے کر دو اور آئندہ لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنانے سے توبہ کر لو۔“

”ایسا ہونا ممکن نہیں، تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو، اگر تم نے میرے یہاں آنے کی مجبوری کی تو گولی تمہاری کھوپڑی سے آر پار کر دوں گا۔“ ریحان نے شہریار کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر وہ کمرے کی کچھلی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ اب اُس کے قدم ایم آر کے اڈے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ وہ جب اڈے میں پہنچا تو ایم آر اور باؤ لطیف باتوں میں مصروف تھے۔

”کل ریحان کا کام تمام کرنا ہے، ان گولیوں میں سے ایک گولی ریحان گولی کو لگے گی، اب وہ ہمارے لیے خطرہ بنتا جا رہا ہے، اخبارات اور نیوز چینلز پر اس کے بارے میں بہت سی خبریں آ رہی ہیں۔ اب اُس کو آخری کام گولڈن مارکیٹ میں فائرنگ کرنے کا دینا ہے۔“ ایم آر اور باؤ لطیف کی باتیں ریحان نے سن لی تھیں۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ اُس نے ایسا ظاہر کیا کہ جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ ایم آر نے اُسے دس گولیاں دے کر دس انسانوں کو موت کی نیند سلانے کے لیے کہا۔ ریحان نے چھ گولیاں اپنے پستول میں ڈال لیں۔ پھر اُس نے دونوں کو نشانے پر لے لیا۔ دونوں اس بدلی ہوئی صورت حال سے گھبرا گئے تھے۔ ریحان نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر گولیاں ان کے سینوں میں اتار دی تھیں۔ اُسے ان گولیوں کے چلانے کا ایک ایک لاکھ روپیہ تو نہیں ملا تھا، مگر ان گولیوں کے چلانے سے اس کے پیارے شہر کراچی میں امن لوٹ آنے کی اُمید ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ اب اُس کے قدم پولیس اسٹیشن کی طرف بڑھ رہے تھے کیوں کہ اُس نے ریحان گولی کو ریحان بنانے کا فیصلہ جو کر لیا تھا۔

ہونہار مصور

برف باری کا موسم



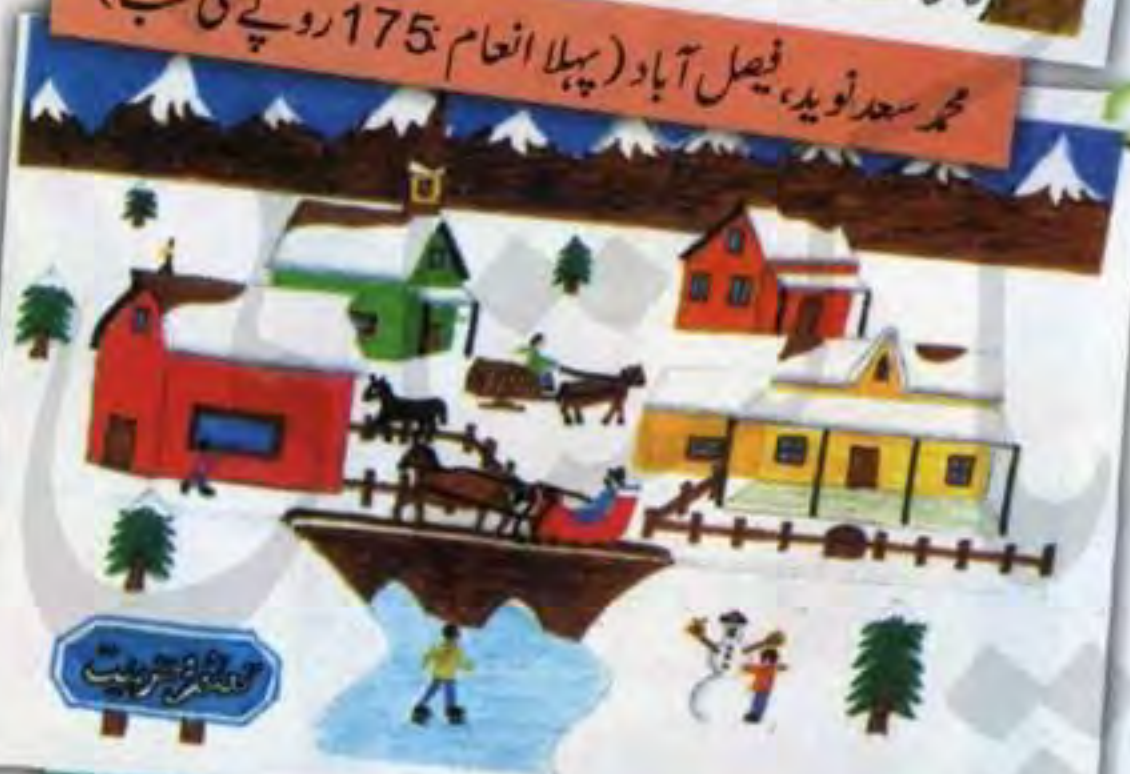
محمد ملک، کراچی (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)



محمد سعد نوید، فیصل آباد (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)



حفصہ شہاب، کوہاٹ (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)



سیف اللہ، ڈیرہ اسماعیل خان (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)



جویریہ شاہ، واہ کینٹ (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)



ثناء نعیم، کراچی (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام یہ ذریعہ قریب اندازاً: محمد احمد رضا انصاری، محمد وقار وکیل انصاری، کوٹ ادو۔ زین العابدین شاہ، خان پور۔ صلاح الدین وڑائچ، گوجرانوالہ۔ زینب احسان، پشاور۔ زرینہ ملک، کراچی۔ عائشہ ادریسی، مظفر گڑھ۔ محمد حمزہ رؤف، انک۔ مقدس فاطمہ، جہلم۔ جواد معاویہ، ذیشان محمود، اسلام آباد۔ نافعہ احسن، کامرہ کینٹ۔ محمد باقر، میاں والی۔ علیہ شاہد، سانی وال۔ زین منیر، گجرات۔ شمسہ کنول، گجرات۔ آمنہ سراج، اسلام آباد۔ روہین فاطمہ، راول پنڈی۔ زویا نوید، واہ کینٹ۔ لاریب قیصر، چکوال۔ عائشہ اقبال، محمد اساور اکرم، تحریم فاطمہ، رابعہ تبسم، زوہا فاطمہ، زوہیب شہزاد، عائشہ بشیر، یاسر نواز، صادق آباد۔ نمرہ ندیم، زبیرہ علی، عمارہ علی، محمد عاطف عارف، فضلہ شہزاد، زینب صدیقی، عائشہ مجید۔ عثمان ریاض، اسد ریاض، عمر رضوان، سعد رضوان، لاہور۔ عمیر احمد سرگودھا۔ امین رضا، کوئٹہ۔ سجاد ترین، کراچی۔ جدون اکمل، ایبٹ آباد۔ نعمان اقبال، سیال کوٹ۔ رمشاء، گوجرانوالہ۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور نگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پتیل یا ہیڈ ماسٹر سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

باریج کا موضوع
مرئی اور چڑے

فروری کا موضوع
شیر کی تصویر

آخری تاریخ 8 فروری

آخری تاریخ 8 جنوری